مشمولات

سرمایہ دارانہ عقائدونظریات

تقریضات
مولانا عبدالرؤف (صدر جمیعت اتحاد علماء سندھ)
محترم منور حسن (سابق امیر جماعت اسلامی)
مولانا مفتی خالد (استاد جامعہ عثمانیہ)
مولانا عامر بیگ (استاد اسلامک سینٹر)
مولانا محبوب (استاد جامعہ کراچی، شعبہ فلسفہ)

ا۔ سرمایہ داری کا زوال

ا۔سرمایہ دارانہ عقائد

۲۔ آزادی
۳۔ مساوات اور حقوق
۴۔ ترقی

۲۔سرمایہ دارانہ نظریات

۵۔ سیکیولرازم
۶۔ قوم پرستی
۷۔ ہندو مسلم قوم پرستی
۸۔ لبرل ازم
۹۔ سوشل ازم
۱۰۔ سوشل ڈیموکریسی
۱۱۔ انارکزم
۱۲۔ پوسٹ ماڈرن ازم

۳۔ردسرمایہ داری

۱۳۔سرمایہ دارنہ ریاست
۱۴۔سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کے انہدام کی حکمتِ عملی اور جماعت اسلامی کی ذمہ داریاں

سرمایہ داری کے زوال کا دور

ہم آج جس دور سے گزر رہے ہیں یہ سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کے زوال کا دور ہے۔ سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی اس انفرادیت، معاشرت اور ریاست کو کہتے ہیں جہاں حرص وحسد کی عقلیت کا غلبہ ہو۔ سرمایہ دار ہر وہ شخص ہے جو اپنے عمل کی توجیہہ فروغ تصرف فی الارض میں تلاش کرتا ہے۔ سرمایہ دار کے لیے دولت مند ہونا ضروری نہیں، حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ دولت مند تھے لیکن وہ سرمایہ دارانہ تھے، اسی طرح سیٹھ ولی بھائی چھوٹانی (تحریک خلافت کی انتظامی کمیٹی کے صدر ۱۹۱۹ء۔۱۹۲۳ء) بھی دولت مند تھے لیکن وہ سرمایہ دارانہ تھے۔ سرمایہ دولت کا ظالمانہ استعمال ہے۔ جب دولت کے استعمال کا مقصد اس کی مقدار میں مسلسل اضافہ بن جاتا ہے تو دولت سرمایہ بن جاتی ہے۔ انہی معنوں میں سرمایہ حرص وحسد کی تجسیم (Concrete Form) ہے، اور سرمایہ دار حرص وحسد کا بندہ (عبدالدرہم ودینار) ہوتا ہے۔ وہ اس بات پر ایمان لے آتا ہے کہ دولت کا مناسب ترین اور درست استعمال اس کی مقدار میں مسلسل اضافہ ہی ہے۔ ہر وہ مزدور، کسان اور مفلس شخص جو اس سرمایہ دارانہ عقلیت کو قبول کرتا ہے ایک سرمایہ دار ہے، کیوں کہ اس نے اپنے نفس کو حرص وحسد کے شیطانوں کے سپرد کردیا ہے۔ سرمایہ دارانہ معاشرت معاشرہ کی اس تنظیم کو کہتے ہیں جہاں سرمایہ (یعنی حرص وحسد) کی عقلیت کی بنیاد پر اجتماعی فیصلے کیے جاتے ہیں۔ یہاں ہر معاشرتی ادارہ مارکیٹ (Market) کے تعقل کے ماتحت ہوتا چلا جاتا ہے۔ خاندان اپنے بچوں کو تعلیم اس لیے دلواتے ہیں کہ وہ زیادہ سے زیادہ سرمایہ جمع کرنے کے قابل ہوسکیں۔ شادی کے رشتوں کا معیار صلۂ رحمی کے بجائے لڑکی اور لڑکے نیز انکے خاندان کی مالی حیثیت پر منتج ہوجاتا ہے۔ چنانچہ تمام اعمال کی قدر کا تعین زر کا بازار (Money Market) اور سرمایہ کا بازار (Capital Market) کرتے ہیں۔

سرمایہ دارانہ معاشرت کو سول سوسائٹی (Civil Society) کہتے ہیں۔ یہ مذہبی معاشرت کی ان معنوں میں رَد ہے کہ اعمال کی اقدار کا تعین (Determination) مذہبی نصوص اور احکام کی بنیاد پر نہیں کیا جاتا بلکہ اس بنیاد پر کیا جاتا ہے کہ وہ سرمایہ دارانہ بڑھوتری میں کتنا اضافہ کرتا ہے۔ سرمایہ دارانہ معاشرے میں قدر (Value) کی غالب شکل قیمت (Price) کی صورت میں ہوتی ہے۔

سرمایہ دارانہ ریاست ریپبلک (Republic) ہوتی ہے۔ یہاں فیصلوں کے لئے اس عمومی اصول کو قبول کیا جاتا ہے کہ صرف وہ اجتماعی چیز جائز ہے جو Citizen کے تصرف فی الارض کو فروغ دینے کے لیے آلۂ کار کے طور پر استعمال کی جارہی ہے۔ اس کو Rousseau نے General will کہا تھا اور کہا تھا کہ اکثریت کی رائے دہی (Will of All) کو اس General will کی تردید کرنے کی کبھی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ آج Citizen کی الوہیّت کے فروغ کے اس اصول کو Human Rights سے متعلق وہ دفعات فراہم کرتی ہیں جو ہر رپبلیکن دستور کی Preambles میں لازماً شامل کی جاتی ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کے غلبہ کی ابتدا پندرہویں اور سولہویں صدی میں ہوئی جب چند یورپی شہری ریاستوں میں معاصی کے فروغ اور انکے علمی جواز کے نتیجے میں یہ نظام غالب آگیا۔ یورپی اقوام کے استعمار اور ریاستی دہشت گردی (بالخصوص امریکا میں جہاں دو صدیوں میں آٹھ کروڑ مقامی باشندے Red Indians قتل کیے گئے) کے زیر اثر اس نظامِ زندگی نے ترقی کی اور انیسویں صدی کے آخر تک تقریباً پوری دنیا پر اس نظام نے ریاستی غلبہ حاصل کرلیا (البتہ انفرادیت اور معاشرت کی سطح پر اس نظام کو کبھی عالمی غلبہ حاصل نہیں ہوا)۔ بیسویں صدی اس نظام کے زوال کی پہلی صدی ہے اور موجودہ دور میں یہ نظام مختلف النوع بحرانوں سے دوچار ہے۔

عرفانِ ذات کے ضمن میں سب سے اہم ترین بحران عقلیت کا ہے، وہ عقلیت جو سرمایہ دارانہ غلبہ کے دور میں فروغ پائی (یعنی ماڈرن ازم) آج عقلاً مہمل ثابت کردی گئی ہے۔ جس فکری تحریک نے یہ کام کیا اس کو پوسٹ ماڈرن ازم (Post Modrenism) کہتے ہیں اور اس کے کلیدی مفکرین Foucault, Derrida, Deluze, Lyotard, Rorty ہیں۔ ان مفکرین نے ثابت کردیا کہ سرمایہ دارانہ کلیدی تصورات بالخصوص آزادی (Freedom) اور ترقی (Progress) مہمل اور ناقابلِ حصول ہیں۔ اس نظام میں انفرادیت لازماً انتشار (Fragmentation) کا شکار ہوتی ہے اور اعمال کی معنویت کی جستجو محض لغوی کھیل (Language Game) ہے۔ کسی انفرادی یا معاشرتی عمل میں عقیدے کی کوئی توجیہہ بیان نہیں کی جاسکتی اور سرمایہ دارانہ انفرادیت لازماً تحلیل (Deconstruction) کا شکار رہتی ہے۔ دوئم یہ کہ سرمایہ دارانہ نظام نے جن معاشرتی اداروں کا سہارا لے کر اپنی معاشرتی صف بندی کی تھی وہ سب انحطاط پذیر ہیں، سرمایہ دارانہ مارکیٹ اجارہ داری کا شکار ہے اور مسابقتی عمل نیست ونابود ہوگیا ہے۔ اس کے نتیجے میں سرمایہ دارانہ Market کی کارکردگی سے Efficient اور Equitable نتائج برآمد نہیں ہوتے، قیمت کے تعین کا کوئی معروضی (Objective) پیمانہ موجود نہیں۔ لہٰذا زر (Finance) اور اشیاء (Commodity) کے بازاروں کی کارکردگی میں عدم استحکام (Disequilibrium) دائمی حیثیت اختیار کرگیا ہے۔ اور دو ہزار سات (2007) سے شروع ہونے والا بحران کسی صورت قابو میں آتا نظر نہیں آرہا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ غلبے کے دور میں جو واحد اجتماعیت قائم ہوئی تھی وہ طبقہ (Class) کی اجتماعیت تھی، بیشتر سرمایہ دارانہ معاشروں میں مزدور سرمایہ دارانہ خطوط پر منظّم ہوگئے تھے اور مزدوروں کی طبقاتی تنظیمیں (Trade Unions and Social Democratic Parties) سرمایہ دارانہ عدل کے فروغ کے لیے جدوجہد کرتی تھیں۔ اس جدوجہد کی نظاماتی اہمیت کا ادراک سب سے واضح طور پر Keynes اور Boltow کی فکر میں ملتا ہے۔ آج سرمایہ دارانہ عمل کے فروغ کے نتیجے

میں یہ طبقاتی تنظیمیں سرمایہ دارانہ ریاست سے اس طرح منسلک ہوگئی ہیں کہ سرمایہ دارانہ عدل کی جدوجہد ناممکن ہوگئی ہے اور یہ ایسے وقت میں ہوا ہے جب یورپ امریکا میں آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ (طالب علم، بے روزگار، پینشن یافتہ افراد) سرمایہ دارانہ پیداواری اور تجارتی عمل سے بے دخل کر دیا گیا ہے۔

مزدور تحریک کی جگہ ان New Social Movements مثلاً حقوقِ نسواں کی تحریک، اغلام بازوں کی تحریک (جس کا سب سے بڑا پشت پناہ آج صدر اوباما ہے) اور ماحولیاتی تحریک نے لے لی ہے جو محض کھیل تماشا ہیں اور سرمایہ داری کی ترتیبِ نو کی ضمن میں کوئی اہم کردار ادا نہیں کرسکتیں۔

سرمایہ دارانہ ریاستی انحطاط کا تیسرا اہم مظہر جمہوری نظام کی شکست و ریخت ہے۔ میڈیا پر سرمایہ دارانہ غلبے کے نتیجہ میں آراء کی تشکیل کا عمل عوامی نہیں رہا۔ لوگوں کی رائے میڈیا سازی (Media Crafted) کا شکار ہوگئی ہے اور جمہوری عمل تفریح (Entertainment) کا ذریعہ بن گیا ہے۔ نمائندگی (Representation) صرف سرمایہ کی ہے۔ یورپ میں کئی دہائیوں سے انتخابات میں ووٹرز کی شرکت مستقل کم ہو رہی ہے اور ۱۹۴۶ء کے بعد سے کسی امریکی صدر کو عوام کی اکثریت کے ووٹوں سے منتخب نہیں کیا گیا۔ کوئی ووٹ کیوں دے جب کہ میڈیا کئی ہفتے پہلے ہی انتخابات کا نتیجہ بتا دیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ آج کوئی یورپی سیاسی فلسفی جمہوریت کے حق میں دلیلیں دیتا ہوا نظر نہیں آتا۔ Habermas جو آج کل ماڈرنسٹ سرمایہ دارانہ علمیت کا سب سے بڑا وکیل ہے نوحہ کناں ہے کہ مکالمتی عمل (Communicative Action) اتنا مسخ (Distort) ہوگیا ہے کہ Dialogue پر مبنی جمہوریت ناپید ہوتی جارہی ہے۔ Alian Badiou کہتا ہے کہ آج جمہوری عمل وہ زنجیر ہے جس سے عوام کے گھوڑے کو سرمایہ داری کے اصطبل میں باندھا جاتا ہے۔

چوتھی اہم بات یہ کہ سرمایہ دارانہ سرخیل ریاستیں پیہم عسکری شکستیں کھا رہی ہیں۔ امریکا ناکام ہوکر عراق سے بھاگ گیا اور مزید ذلیل ہوکر افغانستان سے بھاگنے کی تیاری میں مصروف ہے۔ لاطینی امریکا میں بولیویا، ایکویڈور، وینزویلا اور کیوبا اس کی سیاسی گرفت کو تاراج کرچکے ہیں۔ آج چند سو اوغر (Ughar) مجاہدین نے گانزو صوبے کے ایک بڑے علاقے سے چینی استعمار کو بے دخل کر دیا ہے اور سنکیانگ میں بھی پیش رفت حوصلہ افزا ہے ان حالات میں چین کسی دوسرے ملک میں عسکری کارروائی کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔

سرمایہ دارانہ نظام کے مسلسل اور ہمہ پہلو زوال سے آج انکار ممکن نہیں رہا لیکن سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کے متبادل کے خدوخال ابھی واضح نہیں۔ ان معنوں میں ہم ایسے دور میں رہ رہے ہیں جس کی تیسری اور چوتھی صدی عیسوی میں مماثلت ہے۔ اس دور میں رومی انفرادیت معاشرت اور سلطنت تحلیل ہو رہی تھی لیکن یہ واضح نہیں تھا کہ نظامِ زندگی کی ترتیبِ نو کن خطوط پر ہوگی۔ اس دور میں رومی نظامِ زندگی کا اختتام Chronic حیثیت اختیار کرگیا تھا آج کی New Political Sociology موجودہ دور کو Liminal اور Transitional گردانتی ہے۔ Baudrillard اقرار کرتا ہے کہ سرمایہ دارانہ اقلیت کی گرفت انفرادیت، معاشرت اور ریاست پر کمزور پڑتی جارہی ہے اور غیر سرمایہ دارانہ انفرادیت، معاشرت اور ریاست قائم ہو رہی ہے۔ سرمایہ دارانہ عقلیت کا دائرہ اختیار محدود ہو رہا ہے اور سرمایہ دارانہ انفرادیت، معاشرت اور ریاست کے اندر سے غیر سرمایہ دارانہ انفرادیت، معاشرت اور ریاست اُبھر رہی ہے۔ Deluze کہتا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی Implode ہو رہا ہے لیکن کیا یہ Implosion ہے یا محض ایک Complexification ہے؟

دیکھیے اس بحر کی تہہ سے اُچھلتا ہے کیا
گنبدِ نیلو فری رنگ بدلتا ہے کیا

اسلامی تجدد و ترمیمیت پسندی

مسلم دنیا پر سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی بزورِ شمشیر مسلط کیا گیا اور ہمارا ابتدائی ردِعمل عسکری جدوجہد ہی کا تھا۔ برصغیر میں اس عسکری جدوجہد کے انتشار کے بعد جمعیت علماء ہند ۱۹۲۰ء میں قائم ہوئی، اور اس سے قبل اور بعد سے علماء کے سوادِ اعظم نے سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کے بارے میں ایک مصالحانہ رویہ اختیار کیا۔ اس رویے کے دو اظہار تھے، ایک رویہ برأت اور انخلا کا تھا۔ چنانچہ علماء اور صوفیاء نے ایسے دائرہ ہائے عمل تلاش کیے جہاں اسلامی انفرادیت اور معاشرت فروغ پا سکے اور اسلامی علمیت کا تحفظ کیا جاسکے، اس ضمن میں سب سے اہم اجتہاد مدارس کا ملک گیر قیام اور انصرام تھا اور یہ کارنامہ علماء بریلی اور علماء دیو بند نے بخوبی انجام دیا۔ دوسرا رویہ دُخول (Penetration) کا تھا اور اس کا اظہار تحریک خلافت اور جمعیت علماء ہند کی دستوری جدوجہد ہے۔ اس رویے کے ذریعے سرمایہ دارانہ نظام حیات کے اُصول اور ترتیب کے اندر وہ گنجائش تلاش کی گئی جس کے ذریعے اسلامی انفرادیت، معاشرت اور اقتدار کو مستحکم کیا جاسکے۔ اس رویے کو Islamic Revionism کہا جاسکتا ہے۔ Islamic Revisionist رویہ سرمایہ داری کو ایک نظامِ زندگی تسلیم نہیں کرتا (وہ اسلام کو بھی ایک نظام نہیں گردانتا) بلکہ جدا جدا سرمایہ دارانہ اعمال کو نصوص صحیحہ کی بنیاد پر پرکھتا ہے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ ان اعمال میں کس نوعیت کی ترمیم اور تبدیلی کے ذریعہ ان کو تعلیماتِ شرعیہ کے مطابق بنایا جاسکتا ہے۔

واضح رہے کہ Islamic Revisionist اور Islamic Modernist رویے میں بنیادی فرق ہے۔ Islamic Modernist مثلاً علامہ اقبال کی تشکیل جدید الٰہیات اسلامی (Reconstruction of Religious Thought in Islam) احکام شریعت کو سرمایہ دارانہ عقلیت کے پیمانہ پر جانچتے ہیں اور ان احکامات میں ترمیم کرکے ان کو سرمایہ دارانہ عقلیت کے مطابق بناتے ہیں۔ یہ Islamic Revisionism کے بالکل برعکس عمل ہے، Islamic Revisionism اسلام کی سرمایہ کاری ہے۔ Islamic Modernism اور Islamic Revisionism میں مماثلت یہ ہے کہ دونوں رویے سرمایہ دارانہ نظامِ

زندگی سے کسی تصادم کو ضروری نہیں سمجھتے بلکہ اس سے مصالحت کے قائل ہیں۔ ابتدأ تصادم سے گریز کا یہ رویہ سیاسی میدان میں ظاہر ہوا اور جمہوریت اور دستوریت کی اسلام کاری پر Islamic Revisionist جماعتوں نے پورا زور صرف کیا۔ ۱۹۷۰ء کے بعد سے سعودی عرب کی سرپرستی میں سرمایہ دارانہ معیشت کی اسلام کاری کی مہم جاری ہے اور اس مہم کی حکومتی سرپرستی کے نتیجے میں پوری دنیا میں اسلامی بینک اور اسلامی سرمایہ دارانہ ادارے قائم ہوگئے ہیں۔

زاہد صدیق مغل صاحب کے ان مضامین میں اسلامی جمہوریت اور اسلامی بینکاری کے ان تجربات کا علمی بنیادوں پر جائزہ لیا گیا ہے۔ آپ کا بنیادی استدلال یہ ہے کہ اس طریقہ سے اسلامی انفرادیت، معاشرت اور اسلامی نظامِ اقتدار استوار نہیں ہوتا بلکہ عملاً Islamic Revisionism اور Islamic Modernism سے ایک ہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے اور وہ ہے سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی میں اسلامی شخصیت، معاشرت اور اقتدار کا مغلوب ادغام (Subordinate Subsumption)۔ اسلامی بینکاری اور اسلامی جمہوریت کو فروغ دے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خیر القرون کے دور کی طرف مراجعت ناممکن ہے کیوں کہ سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور، یہاں تک کہ خلیفہ عبدالحمید ثانی کے دور تک قائم رہنے والی ایک ہزار سالہ اسلامی معاشرت اور ریاست میں نہ کوئی اسلامی بینک موجود تھا اور نہ اسلامی مقننہ۔ Islamic Revisionism حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کی طرف مراجعت اور غلبۂ دین کو ناممکن سمجھتی ہے۔ وہ جہاد سے پہلوتہی برتتی اور سرمایہ دارانہ استعمار کے ہاتھوں ہم نے جو انیسویں صدی میں شکست کھائی اس کو دائمی تصور کرتی ہے، وہ سرمایہ دارانہ نظام کے انہدام کی قائل نہیں بلکہ سرمایہ دارانہ نظام میں شمولیت کے ذریعہ اس سے مستفید ہونے کی قائل ہے۔ اس کے اکابرین کو اندازہ نہیں کہ امت کے تشخص کو اس رویے کے اختیار کرنے سے کتنا عظیم نقصان ہو رہا ہے۔

ہمارا المیہ یہ ہے کہ مسلم زعماء سرمایہ دارانہ نظاماتی زوال سے واقف نہیں۔ وہ انیسویں صدی کے باسی ہیں جب سرمایہ دارانہ نظام ماڈرن تھا اور اس کی موثر مخالفت مشکل نظر آتی تھی اس کے باوجود مجاہدینِ اسلام نے جہاد سے پہلوتہی اختیار نہیں کی۔ آج جب سرمایہ دارانہ نظام زندگی شکست وریخت کا شکار ہے اور مجاہدینِ اسلام نے اسے پے در پے شکستوں سے دوچار کیا ہوا ہے تو ایک مصالحتی حکمت عملی کم ہمتی اور نادانش مندی کے علاوہ اور کیا ہے؟ عملاً اسلامی بینک اور اسلامی جمہوریت کے داعی مجاہدین کے مخالف اور سرمایہ دارانہ غلبے اور استحکام کے آلۂ کار ہیں، یہ غلبۂ دین کی راہ میں اہم رکاوٹیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی نظامِ زندگی کی تسخیر بالآخر جہاد وقتال کی کامیابی پر منحصر ہے، محض کسی علمی دعوتی یا روحانی پیش رفت سے یہ کام سرانجام نہیں دیا جاسکتا۔ اگر Visigoths, Vandals اور Viking رومی سلطنت کو پے در پے شکستوں سے دوچار کر کے نئے نظامِ اقتدار کے قیام کے لیے گنجائش فراہم نہ کرتے تو عیسائی نظامِ حیات کا غلبہ ناممکن تھا۔ یہ بات تفصیل کے ساتھ Osuald Spengles نے اپنے مقالات میں ثابت کی ہے۔ یورپی عوام کی اکثریت نے عیسائی نظامِ زندگی رومن اقتدار کے خاتمے کے تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد اختیار کیا۔

یہ بات اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ اگر سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کو پے در پے عسکری شکستیں نہ دی گئیں اور پیہم علاقائی فتوحات کے ذریعے اس کے نظامِ اقتدار کو بے دخل اور منتشر نہ کیا گیا تو ہم اسلام کاری کے عمل سے کبھی آگے نہ بڑھ سکیں گے۔ تمام علمی، روحانی اور دعوتی کام سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی میں سموتا چلا جائے گا اور غلبۂ دین کی جدوجہد تو درکنار اس کا تصور بھی معدوم ہو جائے گا۔

نظامِ زندگی علمی اور روحانی پیش رفت کے ذریعے غالب نہیں آتے، وہ جہاد اور قتال کے ذریعے غالب آتے ہیں (جیسا کہ فتحِ مکہ کے بعد اسلام کے غلبے کا راستہ ہموار ہوا اور لوگ جوق در جوق داخلِ اسلام ہوئے) کیوں کہ جہاد وقتال وہ مفتوحہ علاقہ جات فراہم کرتے ہیں جہاں نیا غالب نظامِ زندگی بتدریج مرتب کیا جاسکے (اور یہ بات تقریباً دنیا کے ہر نظامِ زندگی کے غلبے کی کہانی سے ثابت ہوتی ہے)۔ یہ ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی سنت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور سے لے کر سلطان معظم خلیفہ عبدالحمید ثانی کے دور تک اسلامی ریاستیں مسلسل جہاد کرتی رہیں اور انہی عسکری فتوحات نے ترتیب فقہ اور کلام، اُصول اور تصوف کے مواقع فراہم کیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سرایا اور غزاوات کا آغاز سن ایک ہجری میں شروع کردیا تھا جبکہ اسلامی علوم کی تدوین کئی سال بعد ممکن ہوسکی۔

جہاد کی اس ناگزیر اولیت کے شعور واحساس نے حضرت زبیر وسیدنا حسین بن علی رضی اللہ عنہما کو یزید کے خلاف خروج عمومی برپا کرنے کے لیے تیار کیا۔ یہ حضرات اچھی طرح سمجھ چکے تھے کہ ملوکیت کے نتیجے میں اگر ایک سیکولر مملکت قائم اور مستحکم ہوگئی تو ایرانی اور بازنطینی نظام زندگی بے دخل نہ کیا جاسکے گا اور اسلامی نظامِ زندگی کا تحفظ اور غلبہ ناممکن ہو جائے گا۔ لہٰذا

باندھ کر سر سے کفن ہاتھ میں لے کر تلوار
ساتھ میں اپنے لیے صرف بہتّر انصار
دشت پُر ہول میں گھر بار لُوٹا کر اپنا
عصمتِ دیں کے لیے سر بھی کٹا کر اپنا
اپنے کردار میں قرآن کے معنی ٹھہرے
دین کے جن کا نبی بانی ثانی ٹھہرے

امام عالی مقام رضی اللہ عنہ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سچے پیروکار اور مرید تھے (اپنے ایک صاحب زادے کا نام بھی ابوبکر رکھا)۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی جہاد اور قتال کی اولیت کو تسلیم کیا، اسی لئے خلیفہ بنتے ہی جیشِ اسامہ رضی اللہ عنہ روانہ فرمایا اور اپنے مبارک دورِ حکومت میں مستقل جہاد کرتے رہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک کی تمام اسلامی قوتیں جہاد کی ضرورت کو تسلیم کر کے ملک میں جاری تمام روحانی، علمی، اصلاحی اور دعوتی کام کو عملِ جہاد سے مربوط اور منسلک کریں۔

سرمایہ دارانہ نظام اپنے دورِ انحطاط میں ایک عرصے سے داخل ہو چکا ہے اور مدت سے شکست وریخت کا شکار ہے، چنانچہ آج اسلام کاری کی بھلا کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ آج اسلامی قوتوں کو مجاہدین اسلام کی عسکری پیش رفت کے نتیجے میں جو مواقع میسر نظر آرہے ہیں، ان سے فائدہ اٹھا کر تحفظ دین اور غلبہ دین کی ایک تطبیقی حکمت عملی مرتب کرنا چاہیے۔

سرمایہ دارانہ عقیدہ ٔ آزادی

عقیدہ اور نظریہ میں فرق:

دورِ حاضر کی اسلامی فکر کی یہ ایک عمومی کمزوری ہے کہ وہ عقائد اور نظریات میں فرق نہیں کر پاتی اور نظریات میں اختلاف کی بنیاد پر عقائد میں اختلاف کا قلم لگاتی ہے۔ عقائد سے مراد ایمانیات ہیں۔ اسلامی ایمانیات میں ایمان باللہ ،ایمان بالرسالت،قبر ،حشر،قیامت،جنت،دوزخ وغیرہ شامل ہیں۔ان عقائد پر ایمان لانا مسلمان ہونے کے لیے لازم ہے۔ہر وہ گروہ جو متذکرہ بالا عقائد پر ایمان نہیں رکھتا کافر ہے اور اس کو کافر کہنا درست ہے۔

نظریات سے مراد وہ تصورات (Theories) ہیں جو عقائد کے اظہار کے لیے ضروری سمجھے جاتے ہیں۔مثلاً دیوبندی اور بریلوی مکتبِ فکر میں عقائدِ اسلامی کے فروغ کے لیے پیر و مرید میں جس نوعیت کا رشتہ قائم کیا جانا چاہیے یا ان رسوم و رواج کی ادائیگی کے بارے میں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے ثابت نہیں لیکن جن کا شرعِ مطہرہ کے احکام سے تصادم نہیں، اختلاف ہے۔ یہ ایک نظریاتی اختلاف ہے، اعتقادی اختلاف نہیں اور اس نظریاتی اختلاف کی بنیاد پر کسی گروہ کو یا اس کے افراد کو دائرۂ اسلام سے خارج قرار نہیں دیا جاسکتا۔

اگلے مضامین میں ہم نے سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کے مختلف نظریات،قوم پرستی،سوشلزم،لبرل ازم،سوشل ڈیموکریسی اور انارکزم کی تفصیل بیان کی ہے۔ یہ سب سرمایہ دارانہ نظریات اس لیے ہیں (نظام ہائے زندگی نہیں) کیوں کہ ان کے ماننے والوں کے عقائد ایک ہیں۔وہ سب سرمایہ دارانہ عقائد پر ایمان لاتے ہیں۔ یہاں ہم سرمایہ دارانہ عقائد کی تفصیل پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔

سرمایہ دارانہ عقائد:

سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کے تین بنیادی عقائد ہیں جن پر ہم جدا جدا گفتگو کریں گے،وہ عقائد یہ ہیں:

۱۔آزادی (Freedom)

۲۔مساوات (Equality)

۳۔ترقی (Progress)

جو شخص ان پر ایمان لے آتا ہے وہ ایک سرمایہ دار ہے اور سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی اختیار کرتا ہے۔ ہر وہ مزدور جو آزادی،مساوات اور ترقی پر ایمان لے آئے اپنی تمام تر مفلوک الحالی کے باوجود ایک سرمایہ دارانہ طرزِ زندگی اختیار کرتا ہے اور ہم اس کو سرمایہ دار کہنے میں حق بجانب ہیں۔اس کے برعکس حضرت سیدنا عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ اور حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف رضی اللہ عنہ اپنی تمام تر دولت مندی کے باوجود سرمایہ دار نہ تھے کیوں کہ وہ آزادی، مساوات اور ترقی پر ایمان نہیں لائے تھے۔ جب ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں تو ہم آزادی، مساوات اور ترقی کے وہ مطالب قبول کرتے ہیں جو تاریخ میں رائج ہیں۔

آزادی کیا ہے؟

یہاں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ ہم آزادی پر بحیثیت ایک نظری اصطلاح کے گفتگو کر رہے ہیں۔نظری اصطلاحات کے معنی لغوی نہیں ہوتے۔آزادی کے لغوی معنی یہ ہیں کہ آپ کچھ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور اس معاملہ میں مجبور نہیں ہیں مثلاً جانور حرکت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔وہ اس معنی میں آزاد ہیں لیکن وہ کلام (بمعنی گفتگو) نہیں کر سکتے ان معنوں میں وہ مجبور ہیں لغوی اعتبار سے آزادی ایک صفت اور صلاحیت ہے جیسے سانس لینے کی صلاحیت ہے کھانا کھانے کی صلاحیت ہے۔اگر انسان کو یہ صلاحیت نہ دی جاتی تو خیر و شر میں تمیز کرنے کے قابل نہ بن سکتا اور وہ خلیفہ فی الارض کا فریضہ انجام نہیں دے سکتا۔لیکن نہ سانس لینے کی صلاحیت کا فروغ نہ طبعی آزادی کا فروغ ایک مسلمان کا مقصدِ حیات ہو سکتا ہے۔مقصدِ زندگی تو اس طبعی آزادی کو اللہ کے احکام کے تابع کر دینا ہے اور اس اطاعتِ الٰہی کو عبادت کہتے ہیں۔عبادت بھی ایک نظریاتی تصور ہے اور اس کے معنی لغت سے نہیں، بلکہ اسلامی کلامی اور فقہی تشریحات سے اخذ کیے جاتے ہیں۔

آزادی بحیثیت ایک نظریہ کے سترہویں اور اٹھارویں صدی عیسوی کے یورپ میں ایجاد ہوئی اور اس تصور کی ایجاد کا سہرا دو اشخاص کے سر ہے۔فرانسیسی سائنس دان ڈیکارٹ (Descartes) اور جرمن فلسفی کانٹ (Kant) ان کے خیال کے تحت انسان کا وجود اس بات سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ سوچ سکتا ہے۔ڈیکارٹ کا مشہور جملہ ہے I think therefore I am (میں سوچ سکتا ہوں لہٰذا میں موجود ہوں) کانٹ نے کہا کہ انسان کے ذہن کی ساخت اس نوعیت کی ہے کہ حواسِ خمسہ سے حاصل کی ہوئی اطلاعات کو وہ صحیح تصورات (Concepts) کی شکل میں مرتب کر سکتی ہے۔اور چوں کہ تمام انسانوں کے ذہن کی ساخت یکساں ہے لہٰذا ہر فرد ایک ہی نوع کے

تصوراتِ حواسِ خمسہ سے حاصل شدہ معلومات کی بنیاد پر مرتب کرتا ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ انسان ذہن کی صلاحیتوں کو استعمال کر کے خود حقائق کا ادراک کر سکتا ہے اور حقائق کے ادراک کے لیے وہ خدا کا محتاج نہیں۔ انسان ان معنوں میں قائم بالذات ہے کہ حقیقت تک رسائی کے لیے اس کا اپنا ذہن اس کی رہنمائی کر سکتا ہے۔ رہے مذہبی تصورات تو ان کی کوئی علمی حیثیت نہیں۔ علم صرف ان حقائق تک محدود ہے جن تک حواسِ خمسہ کو رسائی حاصل ہے۔ باقی تمام حقائق علم کے دائرۂ کار سے خارج ہیں اور ان کا خیر و شر اور انسانی معاملات کی تفہیم اور تشکیل سے کوئی تعلق نہیں۔

ان معنوں میں انسان فطرتاً آزاد ہے اور جو لوگ اپنے اس فطری حق کو استعمال نہیں کرتے وہ کانٹ کے مطابق نابالغ (Imature) ہیں۔ ہر انسان کو آزاد ہونا چاہیے، اس کو ہدایت کے حصول اور حق اور خیر کے تعین کے بارے میں صرف اپنے آپ پر انحصار کرنا چاہیے۔ نظامِ زندگی کو اس طرح مرتب کرنا چاہیے کہ ہر فرد اپنی فطری آزادی کا ادراک کر سکے اور اپنی عقل کے فیصلوں کی اطاعت کر سکے۔

کانٹ نے اپنے ہمسفر فلسفی ڈیوڈ ہیوم (David Hume) کی یہ رائے قبول کی کہ عقل زیادہ سے زیادہ انسانی خواہشات کی تسکین کا جواز پیش کرتی ہے۔ تنویری عقلیت (Enlightenment Rationality) خود غرضانہ عقلیت (Self interested Rationality) ان معنوں میں ہے کہ یہ عقلیت تمام خواہشاتِ نفسانی کی لامحدود تسکین کا جواز فراہم کرتی ہے۔ انسان کا حق ہے کہ وہ جو چاہنا چاہے چاہے۔ کوئی عمل بذاتِ خود حلال یا حرام، اچھا یا برا نہیں۔ ہر وہ عمل جائز ہے جو انسان پسند کرتا ہے۔ بشرطیکہ اس عمل کے وقوع پذیر ہونے کے نتیجہ میں کوئی دوسرا انسان اپنے پسندیدہ عمل کو انجام دینے سے محروم نہ ہو جائے اس ضابطہ کو Principle of Universalisability کہتے ہیں۔

اس قاعدہ کے مطابق چوری کرنے کے عمل کا جواز پیش نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ کوئی یہ نہیں چاہ سکتا کہ ہر شخص کو چوری کرنے کی اجازت ہو۔ اس صورت میں خود اس کی املاک بھی چوری ہو جائیں گی اور یہ ناقابلِ قبول ہے، لیکن زنا بالرضا کا جواز ہے۔ کسی فرد کے زنا بالرضا کرنے سے کسی دوسرے کا زنا بالرضا کا ارادہ تکمیل تک پہنچنے سے نہیں رہ جاتا لہٰذا زنا بالرضا ایک (Universalisable) مستحسن فعل ہے، سرمایہ کی بڑھوتری اور آزادی کا فروغ ایک چیز کے دو نام ہیں۔ آزادی سرمایہ داری کی تجسیم ہے کیوں کہ سرمایہ ایک ایسا سیال ہے جس سے آپ اپنی ہر خواہش پوری کر سکتے ہیں۔ اس سے آپ مسجد بھی بنا سکتے ہیں اور شراب خانہ بھی۔ حلال گوشت کا کاروبار بھی کر سکتے ہیں اور خنزیر کی افزائش بھی اور سرمایہ Universalisable ہے، ہر شخص سرمایہ دار یعنی حاسد اور حریص بن سکتا ہے اور ایک شخص کا حرص اور حسد عمومی حرص اور حسد کے فروغ میں مزاحم نہیں معاون ہے۔ لہٰذا سرمایہ کی بڑھوتری اور آزادی کی بڑھوتری لازم و ملزوم ہیں اور سرمایہ دارانہ مارکیٹیں یعنی زر کی مارکیٹ (Money market) اور سٹے کی مارکیٹ (Capital Market) کسی شے اور عمل کی قدر صرف اس بنیاد پر طے کرتی ہیں کہ اس فعل کے انجام دینے سے یا اس شے کے بنانے سے سرمایہ کی رفتارِ بڑھوتری میں کتنا اضافہ ہو رہا ہے۔ آزادی سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کی بنیادی قدر اس وجہ سے ہے کہ سرمایہ آزادی کی تجسیم، اس کی Concrete form ہے اور فروغِ آزادی، بڑھوتریٔ سرمایہ کے علاوہ کچھ نہیں۔

تصورِ آزادی کی اسلام کاری:

لبرل فکر سے متاثر مسلمان کہتے ہیں کہ آزادی کا مفہوم ''لوگوں کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر خدا کا غلام بنانا ہے یہ بالکل غلط بات ہے اس کی دو وجوہات ہیں:

پہلی وجہ یہ ہے کہ آزادی کی جو تعبیری توجیہ تاریخ میں مرتب ہوئی اس کا مطلب ''انسانوں کو خدا کی غلامی سے رہا کر کے ان کو خود اپنی نفسانی خواہشات کا غلام بنا دینا ہے اور تاریخ نے ثابت کر دیا ہے کہ آزادی پر ایمان لانے والے لبرل، قوم پرست، سوشلسٹ، کبھی خدا کے بندے نہیں بنتے۔ وہ ہمیشہ اپنے نفس کے بندے بنتے ہیں اور خدا سے بغاوت کرتے ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ انسانوں کی غلامی سے آزادی کا مطلب اس نظام ہدایت کا انہدام ہے جو اسلام قائم کرنا چاہتا ہے۔ اسلام ایک مساویانہ (Egalitarian) معاشرہ قائم نہیں کرنا چاہتا بلکہ ایک ایسا معاشرہ تعمیر کرنا چاہتا ہے جہاں اہل تقویٰ کی فوقیت اور بالادستی کو روحانی، سیاسی اور علمی سطح پر تسلیم بھی کیا جائے اور بروئے کار بھی لایا جائے۔ اپنی چودہ سو سالہ تاریخ میں اسلامی معاشرہ ایک درجہ بند (Stratified) معاشرہ رہا ہے اس حد تک کہ شرع مطہرہ واضح صراحت کے ساتھ غلامی کی اجازت دیتی ہے اور غلامی کے ادارہ کے فروغ کے ہی ذریعہ ایک صدی کے اندر اندر پورے مشرق وسطی کو مشرف بہ اسلام کیا گیا۔ آج بھی اگر اللہ تعالیٰ ہمیں فلسطین کشمیر اور افغانستان میں فتح دے تو ہم حربی کفار اور ان کے مسلم معاونین کو غلام بنائیں گے کیوں کہ یہ غیر اسلامی مزاحمت کو ختم کرنے اور اسلامی خاندانی معاشرت میں غیر اقوام کو ضم کرنے کا موثر ترین طریقہ ہے۔

درجہ بند معاشرتی تنظیم کا دوسرا جواز اسلامی نظام ریاست ہے، یہاں سلطان ظل اللہ ہوتا ہے اور ملک کے باقی تمام اس کے رعایا ہوتے ہیں۔ عوام کی حکومت میں شمولیت کا کوئی جواز نہ امام ماوردی نے کبھی پیش کیا، نہ امام ابن خلدون نے، نہ شاہ ولی اللہ رحمہم اللہ نے۔ سلطان عوام کا نہ نمایندہ ہوتا ہے نہ عوامی نمایندگی کی ادارتی صف بندی کا کوئی تصور اسلامی سیاسی فکر میں موجود ہے۔ عوام روحانی اور اخلاقی راہنمائی مرشدین اور مزّکیوں سے حاصل کرتے ہیں اور اپنے سلطان اور اس کے عُمّال کے مطیع ہوتے ہیں۔ سلطان صرف اللہ کا مطیع ہوتا ہے۔ عوام کی رائے کی بنیاد پر کوئی فقہی یہ ریاستی فیصلہ نہیں کیا جاتا۔

اسلام آزادی کو بحیثیت ایک قدر (Value) کے کلیتاً اور صریحاً رد کرتا ہے اور ہر جمعہ میں امام مسجد اعلان کرتا ہے ''وینھیٰ عن الفحشاءِ والمنکر والبغی...... آزادی بغی کی جدید سیاسی شکل ہے اور اسلامی انقلاب اسی بغاوت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کو برپا کیا جاتا ہے۔

مساوات اور حقوق

اس سلسلہ کے پچھلے مضمون میں عرض کیا تھا کہ سرمایہ داری کا بنیادی عقیدہ ''لا الٰہ الا انسان'' ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان واحد اِلٰہ ہے وہ اپنی ذات کا اور اس کائنات کا خالق ہے، خیر و شر کا تعین ارادۂ انسانی کے اظہار کے علاوہ کچھ نہیں۔ آزادی خیرِ مطلق ہے اور آزادی سے مراد یہ ہے کہ انسان کا اختیار کائنات پر لامحدود ہوتا چلا جائے، اصولاً انسان آزاد ہے وہ اپنے اندر یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ قائم بالذت اور خالقِ کائنات بن جائے لیکن عملاً وہ آزاد نہیں اس کی آزادی کو مادی (Material) قوتیں بھی محدود کرتی ہیں اور معاشرتی (Social) قوتیں بھی۔ مثلاً وہ آج نظامِ شمسی سے باہر نہیں جا سکتا، مرنے سے نہیں بچ سکتا، طوفانوں کو نہیں روک سکتا، بغیر ماں باپ کے نہیں پیدا ہو سکتا، امریکا میں دو بیویاں نہیں رکھ سکتا ایران میں خدا اور رسول ﷺ کو گالیاں نہیں دے سکتا، کیوبا میں زمین نہیں خرید سکتا وغیرہ وغیرہ۔

سرمایہ داری ان مادی اور سماجی پابندیوں کے خلاف جدوجہد کا نظام ہے جو ارادۂ انسانی کی متصور اصولی آفاقیت پر لگائی گئیں ہیں۔ عملاً (Practically) انسان آزاد ان معنوں میں ہے کہ وہ اپنی متصور مطلق العنان ربوبیت کے قیام کی مستقل جدوجہد کرنے پر مجبور ہے۔ اسی عملی مجبوری کو اصولی آزادی کہتے ہیں۔ چوں کہ سرمایہ دارانہ عقائد کے مطابق انسان (Human Being) صرف اس ہی وجود کو کہتے ہیں جو اپنی اصولی مطلق العنان ربوبیت پر ایمان لائے۔ لہٰذا ہر انسان اصولاً آزاد اور عملاً مجبور ہے۔ یہی مساوات ہے اور مساوات سے مراد یہ ہے کہ

☆...... ہر انسان یکساں طور پر اپنی مطلق العنان ربوبیت کا دعویٰ کرنے میں یکساں حق بجانب ہے۔

☆...... ہر انسان اس اصولی مطلق العنان ربوبیت کی عملی توسیع کی جدوجہد میں مستقل شمولیت پر مجبور ہے۔

انسان کی اصولی مطلق العنان ربوبیت کی عملی تشریح کا ذریعہ سرمایہ کاری ہے۔ سرمایہ کارانہ عملیات (Processes) میں حصہ لینے پر ہر وہ فرد مجبور ہے جو انسان کی مفروضہ مطلق العنان ربوبیت پر ایمان لے آیا ہے۔ سرمایہ، آزادی (اصولی اور عملی) کی تجسیم (Concrete form) ہے۔ سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کو قبول کرنے والا سرمایہ دار ہوتا ہے۔ خواہ وہ مزدور ہو، منیجر ہو، عوامی نمائندہ ہو، ریاستی بیوروکریٹ ہو، انٹیلکچوئیل (Intellectual) ہو۔ وہ سرمایہ دار انہیں معنوں میں ہوتا ہے کہ وہ انسان کی مفروضہ مطلق العنان ربوبیت پر ایمان لے آیا ہے۔ اور اس مطلق العنان ربوبیت کے عملِ توسیع میں شرکت کرنے پر مجبور ہے۔

سرمایہ دارانہ ریاست اصولی آزادی کو فروغ دینے کے لیے جو ذرائع فراہم کرتی ہے ان کو حقوق کہتے ہیں۔ یہ حقوق تمام سٹیزن (Citizens) کو یکساں فراہم کیے جاتے ہیں اور وہ ان حقوق کے مالک ہوتے ہیں ہر Citizen دوسرے Citizen کا مساوی ہے۔ یہ حقوق دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ہیومن رائٹس (Human Rights) اور سوشل رائٹس (Social Rights)۔

Human Rights لبرل سرمایہ دارانہ ریاستیں فراہم کرتی ہیں اور یہ تین ہیں۔

آزادی حیات (Right of life): اس سے مراد یہ ہے کہ ہر سٹیزن (Citizen) کا یہ حق اور فرض ہے (وہ اس بات میں آزاد اور مجبور ہے) کہ اپنی زندگی آزادی/سرمایہ کی بڑھوتری میں کھپا دے، جو شخص اپنی زندگی کو سرمایہ کی بڑھوتری کے عمل میں نہیں کھپاتا وہ انسان (یعنی Human) نہیں۔ کیوں کہ وہ انسانیت کے مفروضہ عقیدے مطلق العنان ربوبیت پر ایمان نہیں لایا۔ اس اصول کے تحت ۸۰ ملین ریڈ انڈینز (Red Indians) کو امریکیوں نے سترہویں سے انیسویں صدی تک قتل کیا اور مشہور لبرل فلسفی جان لاک (John locke) نے اس قتلِ عام کا یہ جواز پیش کیا کہ ریڈ انڈین اور بھینسوں کا قتل عام یکساں طور پر جائز ہے کیوں کہ نہ بھینسے Human ہیں نہ ریڈ انڈین دونوں نے امریکا کی زرخیز زمینوں پر قبضہ کر کے بڑھوتریٔ سرمایہ کے عمل کو ناممکن بنا دیا ہے۔

دورِ حاضر کے مشہور امریکی سیاسی فلسفی Walzer نے افغان مجاہدین کے قتل کا یہی جواز پیش کیا ہے اور کہا ہے کہ مجاہدین اسلام Human نہیں، وحشی درندے ہیں اور ترقی کی راہ میں حائل ہیں۔

دوسرا Human Right آزادیٔ اظہارِ رائے: (Right of concisenes) ہے۔ ہر سٹیزن کا یہ حق/فرض ہے (وہ اس بات میں آزاد اور مجبور ہے) کہ سرمایہ کی بڑھوتری کو فروغ دینے کے لیے جو تجویز دینا چاہے دے۔ اگر وہ آزادی کو خیرِ مطلق تسلیم نہیں کرتا اور رائے کا اظہار کسی اور مقصد کے لیے کرتا ہے تو اس کو یہ حق میسر نہیں کیوں کہ وہ Human نہیں اور اس اصول کی بنیاد پر Locke نے اپنے کتابچہ (A letter concerning tolaration) میں کہا تھا کہ مسلمانوں کو آزادانہ اظہار رائے کا حق نہیں دینا چاہیے کیوں کہ وہ عیسائیوں کے برخلاف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ابن اللہ نہیں مانتے لہٰذا الوہیتِ انسانی کے منکر ہیں۔ اسی اصول کی بنیاد پر مجاہدینِ اسلام کی وکالت آج امریکا میں جرم گردانی جاتی ہے۔

تیسرا حق: حق ملکیت (Right of Property) ہے:

ہر سٹیزن کا یہ حق/فرض ہے (وہ اس بات میں آزاد/مجبور ہے) کہ وہ اپنی املاک سرمایہ کے سپرد کر دے اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اس پر رزق کے دروازے بند کر دیئے جائیں گے اور حصولِ دولت ناممکن بنا دی جائے گی۔ دولت بنکوں میں رکھ کر اور سٹہ کے بازار (Capital

Market) کے ذریعے سرمایہ میں اضافہ مستقل کیا جاتا ہے، ذاتی ملکیت بتدریج ختم ہوجاتی ہے اور کارپوریٹ ملکیت (Corporate Property) ہر شخص کو سرمایہ کا غلام بنا دیتی ہے۔

لبرل سرمایہ دارانہ ریاست اصولاً یہ Human Rights سب Citizens کو مساویانہ طور پر فراہم کرنے کی پابند ہے۔ اور اس کا دستور اس بات کی گارنٹی دیتا ہے کہ ہر Citizen مساویانہ طور پر ان حقوق اور فرائض کا مکلّف ہے۔ اس ہی چیز کو Rule of Law کہتے ہیں جو کہ حقیقت میں Rule of Law of Capital ہے۔ لیکن ایک سرمایہ دارانہ معاشرت میں تقسیمِ وسائل لازماً غیر مساویانہ ہوتے ہیں۔ کچھ دولت مند ہوتے ہیں کچھ مفلس، کچھ عہدہ دار ہوتے ہیں کچھ ماتحت۔ کچھ باصلاحیت ہوتے ہیں کچھ ناخواندہ وغیرہ اور سرمایہ کی گردش کا عمل لازماً ارتکاز سرمایہ (Accumulation of Capital) کا عمل ہے یعنی سرمایہ بہت سی جگہوں اور ملکیتوں سے کھنچ کھنچ کر مستقلاً چند مقامات اور چند کارپوریشنوں Corporations کے زیرِ تسلط جمع ہوتا رہتا ہے۔ جیسے جیسے سرمایہ دارانہ نظام فروغ پاتا ہے، عملی نامساویت Inequality بڑھتی جاتی ہے۔ اور Human Rights اصولاً موجود اور عملاً ناقابلِ حصول بنتے چلے جاتے ہیں۔ ایک بے روزگار شخص سرمایہ کی بڑھوتری کے لیے اپنی جان کھپانے کا کتنا ہی متمنی کیوں نہ ہو وہ یہ نہیں کر سکتا اور جیسے جیسے سرمایہ دارانہ نظام فروغ پاتا ہے ویسے ویسے بے روزگاروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ ایک عام آدمی اپنی رائے کا اظہار کیسے کرے؟ جب کہ عالمی میڈیا پر صرف تین کمپنیوں کا تسلط مستحکم سے مستحکم تر ہوتا جا رہا ہے اور عوامی رائے سازی ہی کمپنیاں کرتی ہیں۔ ذاتی ملکیت کا وجود کیسے قائم رہ سکتا ہے۔ جب کہ تمام کی تمام دولت سود کے بازار (Mony Market) اور سٹہ کے بازار (Capital Market) کے زیرِ تصرف آگئی ہے۔ ان حالات میں Human Rights عملاً معاشرتی طور پر ایک افسانوی حیثیت اختیار کر گئے ہیں:

''ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے''

اس معاشرتی نامساویت (Social Inequality) کو کم کرنے کے لیے سرمایہ دارانہ اشتراکی اور سوشل ڈیموکریٹ ریاستیں سوشل رائٹس (Social Rights) پیش کرتی ہیں سب سے اہم سوشل رائٹ (Social Right) حقِ اجتماعی سودے بازی (Right of Collective bargaining) ہے۔ اشتراکی سرمایہ دارانہ مفکرین اور سوشل ڈیموکریٹ اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام میں سب سے نمایاں نامساویت (Inequality) مزدور اور منیجمنٹ (Management) کے درمیان تقسیمِ اختیار اور قوت کے ضمن میں پائی جاتی ہے۔ ایک عام مزدور اپنے کمپنی منیجمنٹ (Company Mangement) کے سامنے بالکل بے بس ہوتا ہے کیوں کہ منیجمنٹ جب چاہے اس کو بے روزگار کر سکتی ہے۔ لہٰذا مزدور یونینوں (Union) کو منیجمنٹ کے عمل میں شرکت اور اجرتوں کے تعین میں اختیارات کے مواقع فراہم کر دینا چاہئیں۔ اشتراکی سرمایہ داروں نے ریاستی کاپوریٹ ملکیت (State Corporat property) کے معیشت پر تسلط کی وکالت کی ہے اور سوشل ڈیموکریٹ سرمایہ دارانہ مفکرین نے سرمایہ دارانہ ریاست سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ ایسے فلاحی (Welfare) حقوق فراہم کرے جس کے حصول سے ہر سٹیزن مسلسل بڑھتی ہوئی معقول آمدنی صحت، تعلیم اور رہائش حاصل کر سکے۔

Human اور Social حقوق کی فراہمی کا مقصد سیٹزن کو اس قابل بنانا ہے کہ وہ بڑھوتری سرمایہ کے عمل میں اپنا کردار ادا کر سکے اور اس عمل میں شرکت کے ذریعہ اپنی خواہشات نفسانی کی تکمیل کر سکے یہی سرمایہ دارانہ عدل ہے۔

سرمایہ دارانہ عدل ظلم ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ آج بیشتر اسلامی جماعتیں سرمایہ دارانہ عدل کے قیام کی جدوجہد کا اسلامی جواز پیش کرتی ہیں، Human اور Social حقوق کی وکیل بن گئیں ہیں اور مساوات اور آزادی اور ترقی کو مقاصدِ شریعت کے طور پر قبول کرلیا ہے۔ اس بات کا کوئی احساس نہیں کہ سرمایہ دارانہ عدل کا قیام (جو کہ اصولاً اور عملاً ناممکن ہے) کی جدوجہد سرمایہ دارانہ شخصیت معاشرت اور ریاست کی جدوجہد کے قیام کا حصہ ہے اور آزادی، مساوات اور ترقی کو صریحتاً بحیثیت احداف کے رد کیے بغیر موجودہ حالات میں نہ تحفظ دین ممکن ہے نہ غلبہ دین۔ سرمایہ دارانہ عقائد، آزادی، مساوات اور ترقی کی اسلام کاری ایک ایسی Revisionist تحریک ہے جس کا مقصد اسلامی جماعتوں کو عالمی سرمایہ کا حلیف اور ایجنٹ بنانے کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

ترقی (Progress)

ترقی سے مراد Progress ہے اور Progress کا عقیدہ سرمایہ دارانہ فکر کی امتیازی خصوصیت ہے۔ سرمایہ دارانہ علمیت (Epistemology) کے غلبہ سے پہلے کسی نظامِ فکر نے نہ آزادی کو بحیثیت ایک عقیدہ کے قبول کیا نہ Progress کو۔ ترقی/ Progress، آزادی/ Freedom کا لازمی لاحقہ ہے۔ ترقی/ Progress سے مراد صرف یہ ہے کہ سرمایہ کی بڑھوتری میں لامتناہی اور مسلسل اضافہ مستقل ہوتا رہے۔

ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ عقیدہ ''آزادی'' رکھنے والا شخص اس بات پر ایمان لاتا ہے کہ Human being وہ ہے جو صرف اپنی خواہشاتِ نفسانی کے حصول کی مستقل جدوجہد کرنے کو عقل کے واحد تقاضے کے طور پر قبول کرے۔ وہ صرف اپنے نفس کا بندہ ہو، اس کو Autonomy یا خود کفالت کہتے ہیں۔ ایک Autonomous Human Being اپنی خواہشاتِ نفسانی کے حصول کی جدوجہد اس طرح کرتا ہے تا کہ تمام دوسرے Autonomous Human Beings بھی اپنی خواہشاتِ نفسانی کی جدوجہد بلا غیر ضروری روک ٹوک جاری رکھ سکیں۔

اس عقیدہ کی سب سے واضح توجیہ نظریہ افادیت (Utilitarianism) نے پیش کی ہے۔ Utilitarianism فلسفہ, سرمایہ دارانہ علم Economics کو بنیاد فراہم کرتا ہے۔ اس نظریہ کا پہلا بڑا مفکر Hume تھا جو Adam Smith کا قریبی دوست تھا۔ انیسویں صدی میں سب سے نمایاں Utilitarianism بینتھم (Bentham) اور جان اسٹوٹ مل (John Stwat Mill) تھے اور دورِ حاضر میں Utilitarinism کے نمایاں ترین مفکرین Hare اور Harsuny ہیں۔

نظریۂ Utilitarianism کے مطابق انفرادی اور اجتماعی زندگی کا مقصد لذت (Pleasure) کو مستقلاً انتہائی فروغ دینا (یعنی Maximize کرنا) ہونا چاہیے۔ لذتِ نفس خواہشات کی تسکین سے حاصل ہوتی ہے اور نفس کی تسکین کا واحد ذریعہ "صرف" یعنی Consumption ہے لہٰذا معاشی اور معاشرتی پالیسی کا واحد معقول حدف مجموعی معاشرتی صرف کو لامتناہی اور مستقل بڑھانا (Maximization) ہے۔ صرف (Consumption) میں اضافہ کو ناپنے کے لیے علم Economics نے جو پیمانہ وضع کیا ہے اس کو Gross National Production (GNP) اور Gross National Expenditure کہتے ہیں۔ عملاً ترقی/ Progress سے مراد GNP یعنی مجموعی معاشرتی صرف میں اضافہ کے علاوہ کچھ نہیں۔

Economics کی وہ شاخ جسے Welfare Economics کہتے ہیں اصرار کرتی ہے کہ ترقی کو ناپنے کے لیے GNP کی معاشرتی تقسیم (Social Distribution) کو بھی ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیئے۔ ترقی کو ناپنے کے لیے محض مجموعی معاشرتی لذت (GNP) میں لامتناہی (Maximum) اضافہ کافی نہیں۔ بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ GNP کی تقسیم ایسی ہو کہ تمام افراد اور گروہ لذات کے اضافہ سے مستفید ہوتے رہیں یہی سرمایہ دارانہ عدل ہے اور اس کی سب سے واضح تشریح جان رالز (John Rawls) نے اپنے مشہور "Difference Princeple" میں کی ہے۔ اور ایک فی زمانہ مشہور عالم تشریح Amartya Sen کی کتاب Development as Freedom میں ملتی ہے۔

واضح ہو کہ ترقی (Progress) سے مراد حصولِ لذات کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ لذات کے حصول کا ذریعہ سرمایہ (Capital) ہے۔ لہٰذا ترقی (Progress) کا حصول سرمایہ کی بڑھوتری Accumulation of Capital کے ذریعہ ہی ہوتا ہے، جب کوئی معاشرہ Progress کی جستجو کرتا ہے تو وہ لازماً ایک سرمایہ دارانہ انفرادیت اور ایک سرمایہ دارانہ نظمِ ریاست کو فروغ دیتا ہے۔

یہ بات ہم دورِ حاضر کی تاریخ کے مطالعہ سے اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں، جب سرمایہ دارانہ استعمار یورپ، امریکا، ایشیا اور افریقہ پر غالب آیا تو ان ممالک میں سرمایہ دارانہ انفرادیت کا وجود تھا نہ سرمایہ دارانہ معاشرت کا اور نہ سرمایہ دارانہ نظامِ اقتدار کا۔ سرمایہ دارانہ اشرافیہ نے سرمایہ دارانہ علمیت (Science) کے ذریعہ ان غیر سرمایہ دارانہ شخصیتوں، معاشرتوں اور ریاستوں کو مسخر کیا اور اس سیاسی اور عسکری غلبہ کے نتیجہ میں اپنے گماشتوں (سرسید احمد، ضیا گوقلب، محمد عبدہ وغیرہ) کے ذریعہ سرمایہ دارانہ عقائد اور نظریات کی وسیع پیمانے پر تبلیغ کی اور رفتہ رفتہ یہ عقائد اور نظریات مفتوح علاقوں میں عمومی سطح پر معقول سمجھے جانے لگے۔

سرمایہ دارانہ علوم کو معقول تصور کیے جانے کی سب سے بڑی وجہ سرمایہ دارانہ اشرافیہ کا عسکری غلبہ تھا اور چوں کہ یہ غلبہ Science کی مرہونِ منت تھا لہٰذا یہ تصور کیا جانے لگا کہ ہماری ''سائنسی پسماندگی'' ہماری شکست کا باعث ہے۔ اس بات کو فراموش کر دیا گیا کہ Science کن اہداف کے حصول میں کامیاب ہوتی ہے۔ وہ کامیاب ہوتی ہے لذات کے لامتناہی فروغ (Maximisation) کے ہدف کے حصول میں، وہ کامیاب ہوتی ہے انسان کو Human being بنانے میں اور جیسا کہ ۱۸ ویں صدی کے ایک جرمن پادری Helmit Forstner نے کہا تھا Human Being شیطانی انفرادیت کا دوسرا نام ہے۔

Science انسان کو شیطان بنانے میں کامیاب ہوتی ہے۔ کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا چاہیے کہ اب شیطان بننا مقاصدِ شریعت میں شامل کر دینا چاہیے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے کسی کامیاب زانی کے کارناموں سے متاثر ہو کر زنا کو مشرف بہ اسلام کریں۔

سرمایہ داری ہم پر اس لیئے غالب نہیں آئی کہ ہم تسخیرِ کائنات کے عمل میں اس کے کارندوں سے پیچھے رہ گئے وہ اس لیئے غالب آئی کہ ہم لوگوں کو سرمایہ دارانہ عقائد اور نظریات اختیار کرنے سے نہ روک سکے۔ ہم نے ایک ہزار سال تک یورپ، افریقا اور ایشیا کے وسیع علاقوں پر حکومت کی لیکن نہ ہم یورپ کو مسلمان بنا سکے نہ ہندوستان کو نہ چین کو اگر ہم اس میں کامیاب ہو جاتے تو سائنسی علمیت (جو بقول مولانا مودودی جاہلیتِ خالصہ ہے) کبھی بھی غالب نہ آتی اور تسخیرِ کائنات اور نفسانی خواہشات کے لامتناہی فروغ کو تہذیبی مقبولیتِ عام کبھی بھی نصیب نہ ہوتی۔

ہمیشہ کی طرح آج بھی اسلامی جدوجہد کا مقصد انسان کو مسلمان بنانا ہے لیکن سرمایہ داری کے گماشتے انسان کو شیطان (Human Being) بنانے کے لیے برسرِ کار ہیں۔ سرمایہ داری کے یہ گماشتے عموماً مسلم قوم پرست ہیں۔

تصورِ ترقی کی اسلام کاری:

ترقی کی اسلام کاری کا عمل انیسویں صدی میں شروع ہوا اور اس کو مسلم قوم پرست استعمار مخالف قومی تحریکوں نے اپنایا۔ یہ جماعتیں مثلاً مسلم لیگ خالصتاً سیکولر مذہب دشمن جماعتیں تھیں لیکن انہوں نے اسلامی استعارے (Symbols) اور نعرے اختیار کیئے اور مسلمانوں کو ایک قوم بنا دیا۔ اس ''مسلم قوم'' کا مفاد دوسری تمام سرمایہ دارانہ اقوام کی طرح لذات کا لامتناہی فروغ (Maximization) ہی تھا۔ انہوں نے اسلامی علمیت (بالخصوص کلام) کو لغو اور ناقابلِ عمل گردانا اور دعویٰ کیا کہ Science مسلمانوں کی ایجاد ہے۔ مسلم قوم پرست، معتزلہ دہریوں کے پیروکار ہیں۔ انہوں نے لبرل جمہوریتوں کو اپنے ماڈل (Model) کے طور پر قبول کیا اور جب انہیں اقتدار حاصل ہوا تو انہوں نے خالص سرمایہ دارانہ نظامِ اقتدار قائم کیا۔ ان کی ''اسلامی جمہوریتوں میں'' نہ شریعتِ مطہرہ کے لیے کچھ گنجائش تھی نہ اسلامی علمیت اور روحانیت کے فروغ کے لیے۔ ان کا مقصد ترقی (Progress) کی جستجو کے ذریعہ مسلمان کو سرمایہ دار بنانا تھا۔ سرمایہ دار کو مسلمان بنانے کو یہ ایک نامعقول عمل گردانتے ہیں۔

ترقی (Progress) کی اسلام کاری کی دوسری کاوش اسلامی Revisionist نے کی۔ اسلامی Revisionist وہ مفکرین ہیں جو نظامِ زندگی کی کلیت سے سہو نظر کر کے اس نظام زندگی کے انفرادی اعمال کا اسلامی جواز پیش کرتے ہیں۔ اس کی ایک اہم مثال مولانا تقی عثمانی کی کتاب ''اسلام اور جدید معیشت و تجارت'' ہے۔ اس کتاب میں مولانا تقی عثمانی نے اس بات سے انکار کیا کہ اسلام ایک نظام زندگی ہے اور اسٹاک ایکسچینج، کارپوریشن اور سرمایہ دارانہ تعینِ قیمت کے عمل کا اسلامی جواز پیش کیا۔ اس ہی فکر کی بنیاد پر اسلامی بینکاری فروغ پا رہی ہے، جو سرمایہ دارانہ سود اور سٹہ کے مارکیٹوں Money and Capital Markets کا جزوِ لاینفک ہے اور جس کے ذریعہ اسلامی دنیا سے ہر سال اربوں ڈالر نیویارک، لندن اور زیورخ منتقل ہوتے ہیں اور جس اسلامی بینکاری کو جید ترین دیوبندی علماء نے حرام قرار دیا ہے۔

اسلامی جمہوری جماعتیں بھی ترقی کی اسلام کاری کے عمل میں شامل ہیں۔ یہ جماعتیں، اسلامی بینکار اور اسلامی اکنامسٹ (Ecoonomists) دعویٰ کرتے ہیں کہ احکامِ شریعت کی پابندی ترقی (Progress) کا بہترین ذریعہ ہے اور اگر اسلامی تعلیمات پر عمل کیا جائے تو معیارِ زندگی میں مستقل لامتناہی اضافہ (Maximisation of Welfare) لازماً ناگزیر ہو جائے گا۔ جماعت اسلامی پاکستان کا 2013ء کا انتخابی منشور اس نوعیت کے دعوؤں سے بھرا پڑا ہے۔ اس دستور کے مطابق اگر جماعتِ اسلامی کو اقتدار حاصل ہوا تو وہ عوام کو وہ تمام ہیومن (Human) اور سوشل (Social) حقوق فراہم کرے گی جو سرمایہ دارانہ ویلفیئر (Welfare) ریاستوں میں میسر ہیں۔ وہ آزادی، مساوات اور ترقی کو فروغ دے گی اور یہی اسلام کا تقاضہ ہے۔ جماعتِ اسلامی سرمایہ دارانہ نظام کی بہترین خدمت کر سکتی ہے اور کیوں نہ ہو ماضی قریب میں IMF نے جناب سراج الحق اور جنرل مشرف نے جناب نعمت اللہ خان کے سرمایہ دارانہ نظام کے بہترین منتظمین ہونے کا بارہا اقرار کیا ہے۔ یہ اس جماعت کا انتخابی منشور ہے جو اسلامی انقلاب برپا کرنے کی دعوے دار ہے۔

آپ ہی اپنی اداؤں پہ ذرا غور کریں

اور طرفہ تماشا یہ کہ یہ منشور ایک ایسے زمانہ میں پیش کیا جا رہا ہے جب سرمایہ داری کے چوٹی کے مفکرین Saloaj Zizek، Alain Badiou، Jacques Derrida وغیرہ برملا ترقی کو ایک ناقابلِ حصول ہدف قرار دے رہے ہیں اور اس بات کا اقرار کر رہے ہیں کہ جو عالمی ماحولیاتی اور مالیاتی بحران سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کو تہس نہس کر رہا ہے اس کی بنیادی وجہ لذت پرستی کا لامتناہی فروغ ہی ہے اور سرمایہ دارانہ نظام خود اس ''ہل مِن مزید'' کی مجنونانہ جستجو کو روکنے کی کوئی اہلیت نہیں رکھتا۔

ہم ایک ایسے دور میں رہ رہے ہیں جب سرمایہ دارانہ نظریات اور سرمایہ دارانہ اعتقادات کی فطری نامعقولیت دو اور دو چار کی طرح واضح ہو چکی ہے۔ آج مسلم قوم پرستی، اسلامی بینکاری اور حقوق کی سیاست کو فروغ دینا ایک احمقانہ حکمتِ عملی ہے۔ ہم انیسویں صدی میں نہیں اکیسویں صدی میں رہ رہے ہیں اور اس صدی میں سرمایہ دارانہ نظام برق رفتاری سے اپنی تباہی کی طرف رواں دواں ہے۔ ہمیں آج ادائیگی فرائض کی طرف دعوت دینا چاہیئے۔ حصولِ حقوق کی طرف نہیں، اسلامی تحاریک کا ہدف عوام اور خواص کی خواہشات اور میلانات کی تبدیلی ہے لوگوں کی خواہشاتِ نفسانی کی تگ و دو کو جواز فراہم کرنا اور اس کو آسان بنانا نہیں۔

اسلامی انقلابی جدوجہد حریص و حاسد شخصیت، شہوت اور غضب سے مغلوب معاشرت اور لذات کو مہمیز دینے والے نظام اقتدار یعنی Welfare State کے قیام اور استحکام کی جدوجہد نہیں۔ ہم عالمی سرمایہ دارانہ نظام کی مکمل اور حتمی (Final) انہدام کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ سرمایہ دارانہ عقائد، آزادی، مساوات اور ترقی اور سرمایہ دارانہ نظریات، لبرل ازم، سوشلزم، قوم پرستی، سوشل ڈیموکریسی کو

بالکل رد کر کے اسلامی شخصیت معاشرت اور ریاست کے غلبہ کے لیے برسرِ پیکار ہیں۔

کیا نصوص صیحہ میں خواہشات نفسانی کو فروغ (Maximise) دینے کی کوئی ترغیب ملتی ہے۔کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور شیخینؓ نے ہمیشہ فقر کو غنا پر ترجیح نہ دی۔کیا پیداوار کو بڑھانے کان کنی کو فروغ دینےچتوں کو بڑھانے، سڑکوں اور عمارات کی تعمیر کرنے کے حق میں ہمیں کوئی احادیث ملتی ہیں اور اگر نہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ خواہشات نفسانی کو فروغ دینا، اپنے حقوق طلب کرنا، تسخیر کائنات کی جستجو میں لگے رہنا مکروہ اعمال ہیں۔آج اسلامی جماعتیں ان احداف کو فروغ دے کر صرف سرمایہ دارانہ آدرشوں سے اپنی مرعوبیت کا اظہار کرتی ہیں۔ ان کے پاس عوام اور خواص کی خواہشات کو تبدیل کرنے کا کوئی ایجنڈا نہیں، وہ ایک شریعت پابند (Shariah Constrained) سرمایہ دارانہ نظام قائم کرنا چاہتی ہیں۔ یہ ایک نامعقول اور لغو سعی ہے اور وہ اس میں ان شاءاللہ ضرور ناکام ہوں گی۔

سیکولرازم کیا ہے؟

سیکولرازم کے تصور کا بانی ایک عیسائی مفکر سینٹ آگسٹین (Saint Augestene) ہے۔سینٹ آگسٹین نے چوتھی صدی عیسوی میں ایک کتاب ''سٹی آف گاڈ (City of God) لاطینی زبان میں لکھی۔اس کتاب میں کہا گیا ہے کہ دنیا میں عملاً دو سلطنتیں، یعنی دو نظامِ اقتدار قائم ہیں ایک نظام ہے، ''سٹی آف گاڈ'' جس میں خدا کی حکمرانی ہے۔اس نظام کو چرچ مرتب اور نافذ کرتا ہے، اور یہ نظام خدا اور انسان کے رشتہ کو قائم رکھنے اور مضبوط بنانے کا ذمہ دار ہے۔ یہ نظام عیسائیت کی تشریح اور تنفیذ کرتا ہے، اس نظام کا حاکمِ مطلق ''پوپ'' ہے، پوپ عیسائیت کی جو تشریح چاہے کرے کیوں کہ روح القدس (Holy ghost) ہر پوپ میں حلول کر جاتی ہے۔ ہر عیسائی پوپ کا بندہ ہے۔

دوسرا نظام ''سٹی آف مین'' (City of man) ہے۔اس نظام کا مقصدِ وجود......انسانوں کے آپس کے تعلقات کی ترتیب اور تدوین ہے اور ان کے دنیوی اغراض و مقاصد کا فروغ ہے۔اس نظام کو چلانے کے لیے اقتدار رومن شاہنشاہ Romon emperor کو پوپ سونپ دیتا ہے۔اور رومن شہنشاہ رومن قانون (Roman Law) جس کا ماخذ روم کی روایات ہیں۔ رومن شہنشاہ اسی رومن لاء کے ذریعے ''سٹی آف مین'' پر حکومت کرتا ہے۔City of man میں رومن شہنشاہ انہی معنوں میں حاکمِ مطلق ہوتا ہے جن معنوں میں پوپ City of God میں حاکمِ مطلق ہوتا ہے۔رومن شہنشاہ کو حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ رومن لاء کی جو تشریح چاہے کرے۔

چوتھی صدی عیسوی میں رومن شہنشاہ Constantine نے عیسائیت قبول کر لی۔اور سینٹ آگسٹین کا وضع کردہ سیکولرازم کا یہ تصوراتی نظام تقریباً ہزار سال تک یورپ میں نافذ العمل رہا۔اس نظام کے خلاف منظّم بغاوتیں چودھویں اور پندرھویں صدی میں شروع ہوئیں، یہ سبھی مذہبی بغاوتیں تھیں، اور ان کے برپا کرنے والے پروٹسٹنٹ عیسائی فرقے تھے۔ان فرقوں نے پوپ کے City of God کے اقتدار کے خلاف بغاوت کی۔ ان بغاوتوں کو مقامی سیاسی مقتدر خاندانوں کا شمالی یورپ میں بھرپور تعاون حاصل تھا۔ جہاں جہاں یہ تحریکیں کامیاب ہوئیں وہاں مطلق العنان بادشاہت Absolute Monarchy قائم ہوئی۔ اور ایک قومی چرچ (National Church) وجود میں آیا، جس کا سربراہ قومی بادشاہ قرار پایا۔اس دور کے آخر میں ایک کلیدی معاہدہ Treaty of west phalia کے ذریعے سیکولر نظام کی ایک نئی تشریح کی گئی۔متصادم ریاستیں Catholic اور Protestant اس بات پر متفق ہوگئیں کہ ہر مطلق

العنان بادشاہ اپنے راعی کا یہ حق تسلیم کرے گا کہ وہ جو مذہب چاہے اختیار کرے۔ گو کہ ریاست کا ریاستی مذہبی نظام وہی ہو گا جو مطلق العنان فرماں رواں اختیار کرے گا۔ اس نظریہ کو Doctrine of Toleration کہتے ہیں۔

تنویری سیکولرازم:

سترہویں اور اٹھارہویں صدی عیسائیت کے خلاف اہم ترین فکری بغاوتوں کا دور ہے۔ ان بغاوتوں کو Enlightenment (تنویریت) کہتے ہیں۔ اس کے کلیدی مفکر Newton، Locle، Kant، Hegel، Deaurtes اور Marx ہیں۔ ان مفکرین کے نظریات جدا ہونے کے باوجود اس بات پر یہ متفق ہیں کہ انسان Human Being ہے۔ Human being سے مراد ایک ایسا نوعی وجود ہے جو احد وصمد ہے۔ وہ جو اپنی ذات اور اپنی کائنات خود تخلیق کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ قائم بالذات ہے، اور کسی کا عبد نہیں ہے۔ اس کی انفرادی نوعی جستجو کا مقصد تسخیر> کائنات ہے، اس کو حق ہے کہ خیر اور شر کا تعین خود کرے اور اپنی تمام خواہشات کی تکمیل میں جو عمل معاون ہو رہا ہو وہ خیر ہے۔

یہ تنویری عقائد ہیں، تنویری عقلیت ان عقائد کو ثابت نہیں کرتی۔ یہ اس کی مفروضات presumptions ہیں۔ ان عقائد پر ایمان لائے بغیر انسان Human being نہیں بن سکتا۔ جو انسان Human being نہیں وہ enlightenment کے نظامِ اجتماعی کا رکن نہیں بن سکتا اور اسے کوئی بھی Human Right حاصل نہیں۔ Locke نے یہ بات واضح طور پر کہی ہے کہ اسّی ملین Red Indians (امریکا کے قدیم باشندوں) کا قتل اتنا ہی جائز تھا جتنا بھینسوں (Bison) کا شکار، کیوں کہ نہ بھینسے Human being تھے نہ امریکا کے قدیم باشندے۔

Human being جو نظامِ اقتدار قائم کرتا ہے اس کو دستوری جمہوریت (Constitutional republic) کہتے ہیں۔ اس نظام اقتدار میں (اصولاً) مطلق العنان فرمانروا سٹیزن (Citizen) ہوتا ہے۔ Citizen کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ تنویری عقائد کی بنیاد پر نظامِ اجتماعی چلانے کے لیے جو قوانین اور اصول چاہے وضع کرے۔ شرط صرف یہ ہے کہ یہ اصول و قوانین فروغِ آزادی، تسخیرِ کائنات اور خود تخلیقیت (Self determination) کے حصول کا ذریعہ ہوں۔

اس نظامِ اجتماعی میں سیکولرازم کے لیے دو گنجائشیں موجود ہیں:

الف : جمہوری دستور Treaty of westphalia کے اصول کو قبول کرنا کہ مذہب ایک انفرادی معاملہ ہے جس کا نظامِ اجتماعی کی ترتیب اور تنفیذ سے کوئی تعلق نہیں۔ ہر شخص جو مذہبی عقائد اختیار کرنا چاہے کر سکتا ہے، لیکن یہ عقائد مابعد الطبیعاتی (Metaphysical) ہوں۔ اخلاقی (Ethicl) نہ ہوں۔ مثلاً یہاں ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ زنا سے اجتناب کرے اور زنا کو برا سمجھے، لیکن اس کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنی بیٹی کو زنا سے اجتناب کرنے پر مجبور کرے۔ کیونکہ زنا کرنا بیٹی کا Human Rights، ہے۔ ہر شخص مذہبی روایت اپنی پسند کی بنیاد پر اس طرح قبول کرنے کا حق رکھتا ہے کہ یہ مذہبی عمل تنویری اجتماعیت (Constitutional republic) کے مقاصد کے حصول کی راہ میں رکاوٹ نہ بنے، بحیثیت Citizen وہ فروغِ آزادی اور حصولِ تسخیر کے کائنات کے مقاصد کی معاشرتی اور ریاستی بالادستی کو تسلیم کرنے پر مجبور ہے۔ یہی چیز اس کو Human being بناتی ہے اور اسی کی بنیاد پر اس کو Human Rights کا حق دار تصور کیا جاتا ہے۔

ب: ہر فرد اور گروہ کو اس بات کا حق بھی حاصل ہے کہ وہ اپنے مذہب کو تنویری مقاصد آزادی، تسخیر کائنات، اور خود تخلقیت کے حصول کا ذریعہ ہونے کی تبلیغ کرے اور ان مقاصد کے حصول کی جدوجہد کی ایک مذہبی تشریح پیش کرے یہ کام Newton، Kant، Locke اور Hegal نے شروع کیا اور وہ سب اپنے آپ کو پکا اور مخلص عیسائی تصور کرتے تھے۔

آج دو تحریکیں یہ عمل کامیابی سے جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ایک Evangelism اور دوسری Zionism ان گروہوں کا دعویٰ ہے کہ مذہب کی جو تشریح وہ پیش کرتے ہیں وہ تنویری اقتدار کے حصول کا بہترین ذریعہ ہے۔ Evanglists کہتے ہیں کہ امریکی دستور جس کی بنیاد پر دنیا کی کامیاب ترین ریاست قائم ہے عیسائی تعلیمات سے محفوظ ہے۔

برصغیر میں سیکولرازم:

برصغیر کی کامیاب ترین مذہبی سیکولر تحریک سنگھ پریوار اور بی جے پی ہے۔ جس نے ہندو مذہب کی خالص سیکولر تشریح پیش کی ہے اور اس کی بنا پر بڑے پیمانے پر عوامی پذیرائی حاصل کی ہے اور کانگریس نے بھی عملاً ان تشریحات کو قبول کیا ہے۔ برصغیر میں جو سیکولرازم فروغ پایا ہے وہ مذہب کو سراہنے والی سیکولرازم ہے۔ یہ سیکولرازم ہندوستان کے تمام مذاہب کو عزت کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور ان کو ہندوستان کے لوک ورثہ کا اہم جز سمجھتی ہے۔ یورپی سیکولرازم کی طرح ہندوستانی سیکولرازم بھی مذہب کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ رائج شدہ سرمایہ دارانہ جمہوری نظامِ اقتدار کا جائز ہونے یا نہ ہونے کا سوال اٹھائے یا اس کی Legitemacy کو چیلنج کرے۔ مذہبی ترجیحات، رسومات اور تشخص لازماً دستوری ریاستی نظامِ اقتدار کی فیصل حاکمیت (Soverignity) کو تسلیم کرتی ہیں اور اسی وجہ سے ان کو سیکولر ریاستی نظامِ کا تحفظ حاصل ہے۔ جمعیتِ علماء ہند اور جماعتِ اسلامی ہند ان معنوں میں سیکولر جماعتیں ہیں کہ انہوں نے دستوری نظامِ اقتدار کی بالادستی اُصولاً اور عملاً قبول کر لی ہے اور ان کی دعوتی اور علمی جدوجہد بھی اس سیکولر نظامِ اقتدار سے متصادم نہیں۔ یہ دونوں جماعتیں کانگریس کی سیکولرازم کو بی جے پی کی سیکولرازم پر ترجیح دیتی ہیں، اور ان کا دعویٰ ہے کہ ہندوستانی انفرادیت اور معاشرت کو صرف ہندومت سے منسلک کرنا درست نہیں اور اگر تمام مذاہب کی تکریم (Respect) برقرار رکھنا ہے تو ہر مذہبی تشخص کو سیکولر نظام میں سمو جانے اور یکساں فروغ دینے کے مواقع فراہم کیے جانے چاہئیں۔ چوں کہ کانگریس اس دلیل کو اصولاً نہرو کی تحریرات بالخصوص (Discovery of India) کی بنیاد پر قبول کرتی ہے لہٰذا عملاً جمعیتِ علماء ہند، جماعتِ اسلامی ہند اور یوپی کی مسلم مجلس عملاً کانگریس کی حلیف سیاستی جماعتیں بن گئیں

ہیں اور یہ تینوں جماعتیں ہندوستانی سیکولرازم کے استحکام کو اسلام کے تحفظ کے لیے ضروری سمجھتی ہیں۔

پاکستانی سیکولرازم اور اسلامی جدوجہد:

حاجی صاحب ترنگ زئی کی شہادت اور تحریکِ ریشمی رومال کی ناکامی کے بعد علماء ہند نے اپنی سیاسی جدوجہد کو سیکولر خطوط پر مرتب کیا۔ ۱۹۱۸ء/۱۹۱۹ء میں تحریکِ خلافت وجود میں آئی اور ۱۹۲۰ء میں جمعیت علماء ہند قائم کی گئی۔ یہ دونوں تنظیمیں تحریکِ استخلاصِ وطن کا حصہ تھیں۔ جس کی عملی قیادت گاندھی کر رہا تھا، گاندھی کا طریقۂ کار عدمِ تشدّد (ستیہ گرہ)(Non Violent Boycott) پر مبنی تھا۔ عدمِ تشدد پر مبنی تحریک ایک قانونی، احتجاجی اور مفاہمتی مطالباتی تحریک تھی جس کا مقصد برصغیر کے باشندوں کے لیے سرمایہ دارانہ جمہوری دستوری حقوق کا حصول تھا۔ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں سیکولر قوم پرست جماعتیں تھیں، علماء دیوبند اور علماء بریلی نے ان جماعتوں کی ماتحتی قبول کر لی اور ہندوستان میں احیاءِ ریاستِ اسلامی کو ناممکن سمجھ لیا۔

قیامِ پاکستان کے بعد لبرل سیکولر دستوریت کی اسلام کاری کا عمل بروئے کار لایا گیا۔ (Basic Principels Resolution) منظوری کے بعد پاکستان کے دستور کو اسلامی گردانا گیا اور اسلامی جماعتوں کی جدوجہد اسی دستور کے تناظر میں مرتب کی گئی چوں کہ یہ دستور خالصتاً سیکولر اور لبرل ہے، شریعت کی بالادستی کو تسلیم نہیں کرتا اور نہ ہی علومِ اسلامیہ کی بالادستی قبول کرتا ہے لہٰذا اس کے تناظر میں جدوجہد کرنے والی اسلامی جماعتوں کی جدوجہد پیہم ناکامی کا شکار رہے۔ یہ تحریکیں مطالبات اور احتجاج سے کبھی آگے نہیں بڑھ سکیں، سیکولر نظام میں اسلامی جماعتوں کے سمو جانے کا سب سے واضح ثبوت MMA کا دو ہزار دو سے دو ہزار سات تک دورِ حکومت فراہم کرتا ہے۔ MMA اپنے دورِ اقتدار میں اسلامی علامتی اقدام تک میں ناکام رہی۔ حسبہ بل کو افتخار محمد چودھری (جس کو آج جماعتِ اسلامی قوم کا نجات دہندہ تصور کرتی ہے) بیک جنبشِ قلم مسترد کر دیا تھا۔ فوج کے مجاہدینِ اسلام کے خلاف مظالم جاری رہے، حکومتی سودی کاروبار اپنے عروج کو پہنچ گیا۔ یہ سب اس لیے ہوا کہ ایم ایم اے میں شامل جماعتیں دستورِ پاکستان کو احکاماتِ شریعتِ مطہرہ پر بالادست تسلیم کرتی ہیں اور صرف وہی جدوجہد (مطالباتی، احتجاجی، Non Violent، ستیہ گری) کرنے کی قائل ہیں جس کی اجازت پاکستان کا دستور ان کو دیتا ہے؛

اور تم سوائے شور کے کچھ بھی نہ کر سکو
کیا خوب لڑ رہے ہو کہ مارو نہ مر سکو

سیکولر دستوری نظام میں ماتحتی قبول کر کے اسلامی جماعتیں جمعیتِ علماء اسلام، جمعیت علمائے پاکستان اور جماعتِ اسلامی اپنی اسلامی سیاسی شناخت کھوتی جارہی ہیں۔ جمعیتِ علماء اسلام پیپلز پارٹی کی حلیف تھی، اب جماعتِ اسلامی عمران خان کی ساتھی بننے کی متمنی ہے۔ کیا یہی اسلامی سیاست ہے؟

سیکولرازم کو قبول کرنے کا طریقہ صرف سیاسی نہیں معاشرتی بھی ہے، اس معاشرتی طریقہ کو اختیار کرنے والے غلبۂ اسلام کی ضرورت کا انکار کرتے ہیں۔ وہ اقتدارِ اسلامی کے قیام کی جدوجہد سے عملاً لاتعلق رہتے ہیں۔ یہ رویہ صوفیائے چشتیہ اور قادریہ نے تیرہویں صدی سے اپنایا ہوا ہے۔ جب تک برصغیر میں اسلامی سلطنت قائم رہی اس رویہ کے جواز میں یہ کہا جاسکتا تھا کہ چوں کہ سلطان ظل اللہ ہے لہٰذا صوفیاء یکسو ہو کر ہندوستان کے باشندوں کو مسلمان بنانے کا کام کریں اور معاملات اقتدارِ سلطان ظل اللہ کے سپرد کر دیں۔ سلسلہ نقشبندیہ نے اکبر اور جہانگیر کو عسکری شکست دے کر ریاستِ اسلامی کو محفوظ رکھا (اور اس ضمن میں حضرت مجدد الف ثانی، شاہ عبدالحق محدث دہلوی اور شاہ ولی اللہ کی جدوجہد نہایت اہم ہے) لیکن جب امام عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ اور داراشکوہ کے درمیان معرکہ برپا ہوا تو یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ بیشتر اہلِ تصوف دارا کے حامی بنے بالخصوص پنجاب میں۔ اور امام عالمگیر اپنے نصف صدی کے دورِ اقتدار میں بہت کم صوفیا کو مغل انتظامیہ کا پیہم جستجو کے باوجود حصہ بنانے میں کامیاب ہو سکے۔

اس سے واضح ہوا کہ سلطنت سے لاتعلقی کے نتیجہ میں اہلِ تصوف کا سیاسی شعور ختم ہوتا چلا گیا۔ سترہویں صدی میں صوفیاء کرام نے عالمگیر جیسے ولی اللہ سے پہلوتہی کی اور بیسویں صدی میں درویشِ خدامست سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو بالکل تنہا چھوڑ دیا۔ پنجاب اور سندھ کے بیشتر پیروں کے خانوادے انگریز کے باج گزار بنے۔ آج ڈاکٹر غلام مصطفی خان اور محمد موسیٰ بھٹو جیسے صوفی اسلامی جماعتوں کو سیاست سے پہلوتہی کا درس دیتے ہیں اور امریکی استعمار کے ہم نوا یوسف قرضاوی اور وحید الدین خان کے ہم نوا ہیں۔ اس نوعیت کا تصوف روحانی عیاشی کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

نظامِ اقتدار کے قیام کی جدوجہد سے پہلوتہی اسلامی عوامی جماعتوں مثلاً دعوتِ اسلامی اور تبلیغی جماعت نے بھی اختیار کی ہے۔ یہ جماعتیں سیاسی عمل کو گندا کہتی ہیں اور عملاً یہ جماعتیں سیکولر نظام کا حصہ بن گئی ہیں اور سیکولر اقتدار کو کوئی چیلنج پیش نہیں کرتیں۔ یہ اس رائے کا اظہار کرتی ہیں کہ انفرادی اصلاح کے نتیجہ میں نظام اقتدار خود بخود تبدیل ہو جائے گا، ظاہر ہے یہ رائے صرف وہی شخص رکھ سکتا ہے جو انقلابات عالم کی تاریخ سے ناواقف ہے۔

اختتامیہ:

سیکولرازم سے مراد یہ ہے کہ نظام اقتدار اس طرح مرتب ہو کہ Human being کی مطلق حاکمیت (Absolute Soverignity) کارفرما ہے۔ اور اس کے نتیجہ میں مکمل آزادی اور تسخیر کائنات کو ممکن بنایا جاسکے۔ سیکولرازم کے ذریعے ہیومن بینگ کی الوہیت اور صمدیت قائم کی جاتی ہے۔

ہم سیکولر نظام کو کلیتاً، اصولاً اور عملاً رد کرتے ہیں۔ سیکولرازم میں کسی مذہبی پیوندکاری کے قائل نہیں۔ ہماری جدوجہد سیکولر نظام اقتدار کو جڑ بنیاد سے اُکھاڑ پھینکنا ہے۔ سیکولر نظام اقتدار کو ہم جائز (Ligitemete) نہیں سمجھتے اور اس کی قانونی اور دستوری جکڑ بندیوں سے اپنی جدوجہد کو آزاد کرنا چاہتے ہیں۔ ہم اسلامی نظام اقتدار کے قیام کے لیے وہ تمام طریقہ اختیار کرنے کا حق رکھتے ہیں جن کا شریعت مطہرہ ہمیں اجازت دیتی ہے۔ اسلامی حکومت کا قیام اسلامی نظام اقتدار کے قیام

کے جدوجہد کا آخری مرحلہ ہے یہ بات دورِ حاضر میں غزا، صومالیہ، یمن، افغانستان اور چیچنیا میں جاری اسلامی تحریکوں نے ثابت کردی ہے۔

قوم پرستی کیا ہے؟

مدارس اور کالج یونیورسٹی کے طلبہ کیلئے ضروری ہے کہ وہ عصری تحریکات اوران کے رجحانات سے واقف ہوں۔اس سلسلے میں ہم ہر ماہ عصری تحریکات کا ایک تعارف پیش کریں گے تاکہ وہ انہیں پرکھنے کا شعور حاصل کریں اوران سے وابستگی کے مضمرات سے واقف ہوسکیں۔اس سلسلے میں ہم ''قوم پرستی'' کے حوالے سے آگاہ کرنا ضروری خیال کریں گے اس لئے کہ آج کے دور میں ''قوم پرستی'' ایک ناسور کی طرح مسلم معاشرے میں پھیل چکی ہے۔اس کی مقامی طور پر مثالیں مہاجر، بلوچ، سرائیکی، ہزارہ قوم پرستانہ تحریکات ہیں، ہمیں اس بات کو جاننا ضروری ہے کہ قوم پرستانہ خیالات، تصورات اور تحریکات کا اصل منبع کیا ہے؟ تب ہی ہم آگے جاکر موجودہ قوم پرستانہ تحریکات کی صحیح جانچ کرپائیں گے۔

قوم پرستی کا تاریخی پس منظر:

قوم پرستی کی تحریک نے یورپ میں سولہویں، اور سترہویں صدی عیسوی میں جنم لیا۔سب سے پہلی قومی ریاست برطانیہ کی تھی جس نے پاپائے روم کے اقتدار کورد کر کے اختیارات کو Tudor خاندان کے سُپرد کیا۔سولہویں اور سترہویں صدیوں میں یورپ مذہبی جنگوں کا شکار رہا۔جس دور میں پاپائے روم کے حامی (Catholics) اوراس کے باغی (کئی پروٹسٹنٹ فرقے) مسلسل برسرِ پیکار رہے اور ریاستی اقتدار پر قبضہ کرنے کی خواہش کی بنیاد پر یہ جنگیں جاری رہیں اسی دوران پاپائے روم نے فرانس، اسپین اور پرتگال کی قومی ریاستوں کو تسلیم کرلیا۔اسی دور میں ہالینڈ کی پروٹسٹنٹ ریاست بھی قائم ہوئی۔اٹھارویں اور انیسویں صدی میں سویڈن بشمول ناروے، ڈنمارک، اٹلی اور جرمنی کی قومی ریاستیں قائم ہوئیں، بیسویں صدی میں جب ان یورپی حکومتوں نے اپنے استعماری نظام کو ختم کیا تو انہوں نے ایشیا اور افریقہ میں اپنے ماتحت علاقوں میں اقتدار قومی ریاستوں کے سپرد کردیا۔تمام ایشیائی اور افریقی ریاستیں (بااستثناء جاپان اور تھائی لینڈ) بیسویں صدی کی پیداوار ہیں، ان کا اقتداری ڈھانچہ بھی انہی یورپی قوموں نے مرتب کیا۔(اس کی مثال ملائیشیا، انڈیا، پاکستان، خلیجی ریاستیں، عراق، شام، اردن، لیبیا اور تیونس وغیرہ ہیں)۔

قوم پرستی کی تعریف:

قوم پرست تحریک کا بنیادی دعویٰ یہ ہے کہ ایک خاص نسل سے تعلق رکھنے والے اور ایک مخصوص زبان بولنے والوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ بلاشرکتِ غیرے اپنا نظامِ اقتدار یعنی اپنی ریاست تعمیر کریں۔ جہاں ان کی تشکیل کردہ قوم کو اپنی مرضی کے مطابق اپنا نظامِ زندگی رائج کرنے کے مواقع فراہم کئے جائیں۔ لہذا قوم پرست تحریک کی سب سے پہلی ضرورت قوم سازی ہے۔ قوم سازی سے مراد یہ ہے کہ کسی منتخب لسانی یا نسلی گروہ کو یہ بات باور کرانی چاہئے کہ دوسری ''قوم'' ان کا استحصال کررہی ہے اور اس استحصال کو ختم کرنے کیلئے اپنی قومی ریاست بنانا ضروری ہے۔ اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ قوم پرستی سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کو ایک جواز فراہم کرنے والا نظریہ ہے۔ (یہ ایک پہلو ہے جبکہ سرمایہ داری کو جواز فراہم کرنے والے دیگر اہم ترین نظریات لبرل ازم اور سوشل ازم ہیں) یہ بات استحصال کی جو تشریح قوم پرست پیش کرتے ہیں اس سے واضح ہوتی ہے۔ ''استحصال'' سے قوم پرستوں کی مراد ان کی ''قوم'' کی معاشی محرومی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ قوم پرست تحریک کی کامیابی کے نتیجہ میں ایک ایسی ریاست (نظامِ اقتدار) کی تعمیر کا وعدہ کیا جاتا ہے جو منتخب قوم کے سرمایہ دارانہ حقوق کو فروغ دے گی۔ اور سرمایہ دارانہ اہداف یعنی آزادی اور ترقی کا حصول ممکن بنائے گی۔ قوم پرست ''قوم'' کی تشکیل کو سمجھنے کیلئے سب سے اہم مثال دورِ حاضر میں کراچی کی ہے۔ جہاں ایم کیو ایم اس بات میں کامیاب ہوگئی کہ وہ اردو بولنے والوں کو اس بات کا یقین دلانے میں کامیاب ہوگئی ہے کہ کوئی دوسری قوم مثلاً سندھی، پنجابی، پشتون اور بلوچ ان کا استحصال کررہے ہیں۔ اس استحصال کو ختم کرنے کیلئے ریاستی اقتدار پر قبضہ لازم ہے۔ ایم کیو ایم کی کامیابی سے قبل اردو بولنے والے قوم پرست نہ تھے۔ ان کی غالب سیاسی وابستگی جماعتِ اسلامی اور جمعیتِ علمائے پاکستان سے تھی۔ ان دونوں جماعتوں کا اثر ونفوذ ختم کرکے ہی ایم کیو ایم قائم ہوئی ہے اور آج بھی ایم کیو ایم کا سب سے مؤثر مقابلہ ایک مذہبی جماعت ''سنی تحریک'' کررہی ہے۔ قوم پرستی کے اسی خطرہ سے بلوچستان میں جمعیتِ علمائے اسلام اور سرائیکی علاقہ میں سپاہِ صحابہ دوچار ہیں۔ جیسے جیسے بلوچی اور سرائیکی بولنے والے قوم پرست نظریات سے متاثر ہوں گے ویسے ویسے ان کی جدوجہد ''استحصال'' کے خاتمے اور سرمایہ دارانہ حقوق کے حصول پر مرکوز ہوگی اور دینی جماعتوں کا اثر ونفوذ ختم ہوتا چلا جائے گا۔

مسلم قوم پرستی:

برصغیر کی قوم پرست تحریک نے ایک مسلم شناخت بھی تعمیر کی ہے۔ انیسویں صدی کے آخر تک مسلمانانِ ہند کو ''قوم'' ہونے کا شعور نہ تھا نہ کبھی انہوں نے اپنے سرمایہ دارانہ حقوق کیلئے سیاسی جدوجہد کی تھی۔ قوم پرستی بالکل اجنبی تصور تھا۔ اکبر نے کہا تھا۔

ع دیکھئے قوم کہتے ہیں جسے
چند لڑکے تھے مشن اسکول کے

مسلم قوم پرستی کا پہلا ہندوستانی مبلغ سر سید احمد خان تھا۔ اس نے انگریزی تعلیم کو فروغ دے کر مسلمانوں کو باور کرایا کہ ہندو ان کا استحصال کررہے ہیں۔ چنانچہ مسلمانوں کو اپنے (سرمایہ دارنہ) حقوق کے حصول کیلئے انگریزی نظامِ اقتدار میں شمولیت کرنی چاہئے۔ اسی فکر کی بنیاد پر آل انڈیا مسلم لیگ نے تحریکِ پاکستان برپا کی اور پاکستان اپنے قیام کے ۶۵ سالہ دور میں ایک خالص سرمایہ دارنہ ریاست کے طور پر روبہ عمل رہا ہے۔ آج مسلم قوم پرستی ایک کمزور نظریہ ہے، کیوں کہ مسلم قوم پرستی لازماً اسلامی تشخص کو مجروح کرتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلم قوم پرستوں کی جدوجہد سرمایہ دارنہ حقوق کے حصول کی طرف ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ جو شخص سرمایہ دارنہ نظام میں شمولیت کا طلب گار ہے وہ اسلامی طرزِ حیات سے لازماً بتدریج دور ہوتا چلا جاتا ہے۔ تحریکِ پاکستان کے دوران مسلم قوم پرستی کی سب سے بھرپور اسلامی تنقید مولانا مودودیؒ نے مرتب کی تھی لیکن قیامِ پاکستان کے بعد جماعتِ اسلامی عملاً ایک مسلم قوم پرست جماعت بن گئی اور اس فعل نے اس کے دینی اور سیاسی تشخص کو بری طرح مجروح کیا ہے۔ کسی حد تک یہی بات جمعیت علمائے اسلام اور جماعتہ الدعوۃ کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔

''قوم'' اور ''امت'' میں فرق:

اسلام جس سیاسی اجتماعیت کا قائل ہے وہ ''امت'' ہے قوم نہیں!۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے ساتھ تعلق، خواہ وہ کسی بھی خطے، رنگ اور زبان یا قبیلے سے تعلق رکھتا ہو دوسرے مسلمان کے ساتھ اخوت، بھائی چارے، ہمدردی اور دل سوزی کا علاقہ رکھتا ہے۔ وہ کسی سے محبت اسلئے نہیں کرتا کہ وہ اس کے قبیلے سے تعلق رکھتا ہے بلکہ کلمے کی بنیاد پر محبت رکھتا ہے، اسی طرح اگر وہ کسی سے نفرت کرتا ہے تو اس کی نفرت کی بنیاد کلمہ اور قرآن ہے نہ کہ قوم، زبان یا علاقائی حیثیت، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں جابجا مسلمانوں کو بطورِ امت پکارا گیا ہے۔ چنانچہ قرآنِ مجید میں ارشاد ہے:

وکذلک جعلنا کم امة وسطا

ولتکن منکم امة یدعون الی الخیر

ان ھذہ امتکم امته واحدة

امت جو ریاست تشکیل دیتی ہے وہ قومی نہیں ہوتی، ہر مسلمان اس کی رعیت میں شامل ہونے کا حق رکھتا ہے۔ یہ بات بلاخوفِ تردید تمام اسلامی ریاستوں ۔۔ خلافتِ راشدہ، خلافتِ امویہ، خلافتِ عباسیہ، سلجوق بادشاہتوں، خلافتِ عثمانیہ، سلطنت مغلیہ وغیرہ کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔ کوئی بھی اسلامی ریاست قومی ریاست نہیں تھی وہاں اقتدار عوام کے کسی گروہ کے پاس نہیں تھا۔ بلکہ سلطان ظلِ اللہ تھا۔ اور تمام فیصلے شارع علیہ السلام کے احکام کی تعمیل میں صادر کیئے جاتے تھے۔ اسلامی ریاست کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں نمائندگی کا کوئی

نظام نہیں ہوتا۔ نہ ہی مقنّنہ کا کوئی ادارہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کسی قوم کے اقتداری حقوق کے قائل نہیں ہیں۔ عوام اور خواص کے کسی گروہ یا فرد کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ نظامِ اقتدار اپنی مرضی سے مرتب کرے۔ حکم اللہ نے اپنے لئے مخصوص کیا ہے۔ اسی نے حکم دیا ہے کہ صرف اس کے احکام کی تعمیل کی جائے۔

الاله الخلق و الامرا

ان الحکم الاالله

وماامرو الا لیعبدو لله

اسلامی ریاست سرمایہ دارانہ قومی حقوق کے فروغ کا ذریعہ نہیں۔ لہٰذا ہم ہر قوم پرست تحریک بہ شمول مسلم قوم پرست تحریکات، کی نظریاتی اور عملی مخالفت کرتے ہیں معذا ہم دوسری جانب قوموں کے سماجی اور ثقافتی تشخص کو فروغ دینا چاہتے ہیں۔ اقوامِ عالم کے بارے میں صرف وہی تصور ہمیں قابل قبول ہے جسے قرآنِ حکیم نے بیان کیا ہے۔ قرآنِ مجید میں ارشاد ہے۔

یاایھاالناس انا خلقنکم من ذکر وانثٰی وجعلنا کم شعوبا وقبائل لتعارفوا. ان اکرمکم عندلله اتقکم

’’اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہیں گروہ اور قبائل بنایا ہے تا کہ تم آپس میں پہچانے جاؤ۔ مگر درحقیقت تم میں وہی معزز ہے جو زیادہ پرہیز گار ہے‘‘ (الحجرات) یعنی قبیلوں اور قوموں کا اختلاف محض ایک دوسرے کے تعارف کیلئے ہے ایک دوسرے کے ساتھ تفاخر، آپس کی عداوت اور فساد فی الارض کیلئے نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک معزز وہی ہے جو متقی ہے خواہ وہ عربی ہو یا عجمی، وہ افریقی ہو یا شامی، لیکن اگر وہ متقی نہیں ہے تو وہ اپنے آپ کو کتنا ہی اعلیٰ ذات کا بتائے معزز نہیں ہوسکتا۔ قومیں، قبائل اور شعوب کی ترقی یافتہ شکلیں ہیں۔ قوموں کے لسانی اور معاشرتی تشخص کے تحفظ اور فروغ کو احیاء اسلام کا مؤثر ذریعہ بنایا جاسکتا ہے۔ صوفیا کے اس عظیم الشان کارنامے سے مستفید ہوسکتے ہیں، اس کیلئے ضروری ہے کہ مقبولِ عام رسوم وروایات کو شریعتِ مطہرہ کے دائرہ کار میں مرتب کیا جائے اور عوام کے دینی جذبات اور عقیدت کے اظہار کیلئے ایسے طرائق وضع کیئے جائیں جو شرع کی تعلیمات سے متصادم نہ ہوں اور عوام کی قومی ثقافتی روایات کے ہم آہنگ ہوں۔

اسلامی تحریکات کی حالیہ معاشرتی کمزوری کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ کسی اسلامی جماعت نے ایک اقدامی ثقافتی حکمتِ عملی مرتب نہ کی۔ پنجابی، سندھی، بلوچ زبانوں اور روایات کے فروغ کیلئے ہم نے کوئی اسلامی منصوبہ مرتب نہ کیا اور دشمن نے ہماری اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر قومی تشخص کے اظہار کو سیکولرازم کے فروغ کا ذریعہ بنالیا ہے۔ آج پنجابی، سندھی زبانوں میں جو ادب تصنیف کیا جارہا ہے وہ بالعموم اسلام دشمن ادب ہے۔۔۔ کیا کسی اسلامی جماعت کے پاس پنجابی، سندھی، بلوچی زبان اور ثقافت کو فروغ دینے کا کوئی منصوبہ ہے؟!

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

حَسْبِیَ اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّاھُوَ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَھُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ.

ہر مُلک مُلکِ ما است کہ مُلکِ خُدائے ما است

ہندو اور مسلم قوم پرستی

غلام جیلانی خان

تمہید:

15 ویں صدی کے شروع اور 17 ویں صدی کے آخر میں مغربی اقوام نے سیاسی، جغرافیائی اور لسانی تفریق قائم کر کے قیصریت، پاپائیت اور زار وغیرہ جیسی مذہبی جکڑ بندیوں کو روند ڈالا، قیصریت اور پاپائیت کے خلاف مختلف النوع اشتراکِ عمل قائم کر کے مذہب سے برگشتہ ہوگئیں جو کہ دراصل جزوی طور پر ہی سہی کسی نہ کسی معنی میں لبرل ازم، سیکولرازم کو اپنانے میں اور کیپٹل ازم پر ایمان لانے میں مانع تھا...... مغربی اقوام نے اپنے اس کامیاب تجربے کو اپنے ایجنٹوں کے ذریعے نو آبادیات میں نفوذ کرنے کے لیے تیر بہ ہدف نسخے کے طور پر استعمال کیا...... چنانچہ ان علاقوں کے مسلمان زعماء جانے انجانے رویوں کی بنا پر جہاں نسلیّت اور وطنّیت کی بنیاد پر تقسیم ہوئے وہیں خلافت کی قبا بھی چاک ہوگئی اور مسلمانوں کی اجتماعیت بحیثیت امت کے پارہ پارہ ہوگئی عرب اپنی عربیت پر ناز کرنے لگے مصری اپنے فراعنہ یاد آئے، ترک اپنا رشتہ ہلاکو خان اور چنگیز سے جوڑنے لگے، ایرانی اپنی ایرانیت کے جوش میں رستم اور اسفندیار کے قصے الاپنے لگے...... حتیٰ کہ خود ہندوستان میں ایک متحدہ ہندوستانی قومیت کی تشکیلِ نوع کی فکر میں گیتا اور قرآن کو ایک ڈولی میں رکھ کر جلوس نکالے گئے گاندھی کو منبرِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر بٹھا کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اپنا سب سے بڑا لیڈر قرار دیا جانے لگا۔ قومیت کے ان نئے پیمانوں کی تشکیلِ نوع کی لہر اس قدر تند و تیز تھی کہ خود ہندستانی مسلمانوں کی بقاء اور ان کی وحدت کو شدید خطرات لاحق ہوگئے۔ اس فکری تنزلی کا نتیجہ یہ نکلا کہ جمعیتِ علماء ہند کے پلیٹ فارم پر قوم پرست، کمیونسٹ اور سوشلسٹ اور حتیٰ کہ ہندو قوم پرست تک نظر آنے لگے۔ بلادِ اسلامیہ کے دیگر ممالک میں بھی حالات کچھ مختلف نہ تھے کہیں پان (pan) عرب ازم کی تحریک اٹھائی جارہی تھی۔ اسی تحریک کے بطن سے بعث پارٹی نے جنم لیا اور امت نے ناصر، صدام، حافظ اسد کی صورت میں اپنے سینے پر زخم سہے...... کسی نے ترکیت کی قومی تشکیلِ نو کر کے کمال اتاترک جیسا عجیب الخلقت باپ نے جنم لیا...... جب ہندوستان میں مسلمان قومیت کا خمیر خمیرا اٹھایا گیا اور اس کے جراثیم علی گڑھ اور سرسید کی تحریک نے امت کے تنِ نازک میں داخل کیے تو بالآخر نتیجہ یہ نکلا کہ لیڈرشپ علماء کے ہاتھ سے نکل کر جوہر، شوکت، سرسید، آزاد اور جناح جیسے زعماء کے ہاتھ میں آگئی۔ جب تحریکِ خلافت کمزور پڑی تو اس کا تمام تر فائدہ ہندوؤں کو ہوا۔ اسی مسلم قومیت کے آسیب کی وجہ سے سیکولر اداروں، سیکولر سیاست حکومت کو جڑ پکڑنے کا موقع مل گیا۔ گاندھی نے اس تمام صورتِ حال کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اس نے کانگریس کے زیرِ سایہ ہندوؤں کے لیے ایسی حکمتِ عملی تیار کی کہ جہاں خود ہندوؤں کو ہندومت (مذہب) کی طرف پلٹنا مشکل ہوگیا، وہیں گاندھی اس بات میں بھی کامیاب ہوگیا کہ ہندوؤں کے لیے اسلام قبول کرنے کی دعوت کو اجنبی کر دیا جائے کانگریس نے ہندوستانی وطن پرستی کے ذریعے ہندوؤں اور مسلمانوں میں جو دعوت کا

رشتہ تھا اس کو کاٹ دیا۔ برخلاف کانگریس کے مسلم لیگ نے مسلم قوم پرستی کو فروغ دیا جس کے نتیجے کے طور پر ہندوتوا کی تحریک کو جوش وخروش عطا کیا گیا۔

قومیت کے اجزاء ترکیبی:

تاریخی طور پر مغرب نے مختلف قوموں کو ایک قوم بنانے کے لیے تین جذبوں کا باہم مرکب تیار کیا۔ وطن پرستی، دشمن سے بیر یا نفرت، معاشی مفاد سے دلچسپی، لہٰذا یہ قومی جذبے، نفسِ امّارہ کی کثافت کو ابھار کر وجود میں لائے جاتے ہیں حتّٰی کہ ان غیر فطری جذبوں کو فطری بنانے کے لیے یورپ میں ایک ہی نسل پر مصائب کے پہاڑ توڑے گئے عالمی جنگوں کی صورت میں قتل وغارت گری کی گئی...... ماضی میں پنڈت جواہر لال نہرو، ابوالکلام آزاد کانگریس کے زیرِ سایہ ان جذبوں کو باہم یکجا کر کے ایک متحدہ قومیت کی تشکیلِ نوع میں مصروف نظر آتے ہیں۔ ہندوؤں کے بالمقابل سرسید کی پوری تحریک اسی دائرے میں جدوجہد کرتی نظر آتی ہے۔ سرسید کی ہر تحریک کو انگریزوں کی ہمیشہ آشیرباد حاصل رہی۔

روس کے بحیثیت سپر پاور عالمی افق سے غائب ہونے کے بعد اور عالمگیریت کے موجودہ عہد میں قوم، قوم پرستی اور وطن پرستی کی اصطلاح گو کہ اتنی معروف نہیں رہی لیکن قوم پرستی کا فتنہ عالمگیریت کے زیرِ سایہ مقامیت کی شکل میں ایک نئے عفریت کی شکل میں ہمارے سروں پر موجود ہے ...مثلاً زرداری کا پاکستان کھپے، مشرف کا سب سے پہلے پاکستان اور ایم کیو ایم کا ہمارا کراچی کا سلوگن، قائد کا شہر۔ ہر ایک کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں کہ پاکستان اور کراچی کو امت سے کاٹ کر عالمی سرمایہ دارانہ نظام کا حصہ بنا دیا جائے۔ مشرقِ وسطیٰ اور عرب ممالک کی موجودہ ہلچل کے پیچھے عرب قومیت کا بت کارفرما ہے جسے امریکہ کی حمایت حاصل ہے۔

اوپر بیان کردہ تاریخی تناظر میں قوم، قوم پرستی وغیرہ کی تعریف متعین کی جائے گی اور اس کا سرمایہ داری وغیرہ سے جو نسبی اور بدیہی تعلق ہے اس کو بھی واضح کیا جائے گا۔ قومیت یعنی نیشنلزم پر غور کرنے سے پہلے قوم کی اصطلاح کو سمجھنا ضروری ہے۔

قوم:

ہم جانتے ہیں کہ مسلمان کبھی ایک قوم نہیں تھے اسلام مسلمانوں کو من حیث المجموع ''امت'' قرار دیتا ہے۔ برٹش ہندوستان میں مسلمانوں کو ہندوؤں کے بالمقابل ایک قوم بنانے کی کامیاب کوشش سرسید احمد خان اور علی گڑھ تحریک نے کی۔ اسی قسم کی واضح چھاپ غلام احمد قادیانی اور اس کے زعماء کے ہاں بھی ملتی ہے جس کے پیچھے انگریز کی فکر کارفرما تھی۔ 1857ء کے جہاد کی ناکامی، تحریکِ خلافت کا فکری تنزل اور جمعیتِ علماء ہند کی کج روی کے نتیجے میں مسلمانوں کو بھی انہی معنوں میں قوم سمجھا جانے لگا جیسا کہ ہندو ایک قوم ہے۔ اس کج روی نے بحیثیتِ مجموعی مسلمانوں کے اخلاقی، اجتماعی اور سیاسی رویوں پر مہلک اثرات ونتائج مرتب کیے۔ انگریز اس بات میں کامیاب ہو گیا کہ تاریخی لحاظ سے مسلمانوں اور ہندوؤں میں دعوت اور محبت کا جو رشتہ موجود ہے اس کو کاٹ دے۔ صبر، یقین، ایمان، احسان اور صلح رحمی کے فطری جذبات کو، جذبات رذیلہ مثلاً نفرت، حسد، حرص، ہوس مقابلہ ومنافرت میں تبدیل کر دے۔ مغربی فکر کے تناظر میں قوم کا مفہوم اس طرح ابھرتا ہے کہ مشترکہ اغراض ومصالح کے حصول کے لیے متعدد افراد آپس میں مل کر تعاون واشتراک کا عمل کریں اس اجتماع کو عرفِ عام میں قوم کہا جاتا ہے۔

قومیت:

قوم کی اس سادہ تعریف کے تناظر میں اب قومیت کا مفہوم بیان کرنے کی سعی کی جائے گی۔ قومیت ''عصبیت'' سے جنم لیتی ہے یعنی جب ایک خاص گروہ کے لوگ اپنے مشترکہ مفادات، اغراض، مصالح اور ضروریات کے ماتحت یا کسی دوسرے گروہ، نسل، علاقہ وغیرہ کے لحاظ سے ایک قوم بن جاتے ہیں۔ چنانچہ جیسے جیسے اس قوم میں عصبیت پروان چڑھتی ہے اسی قدر ان میں قومیت کا جذبہ شدت اختیار کرتا چلا جاتا ہے۔ اسی اسفل جذبے کے تحت وہ اپنے اندر والوں اور باہر والوں کے درمیان اپنے اور غیر کی حد فاصل قائم کرتا ہے اور اپنی قوم کے ہر جائز اور ناجائز مفاد کو غیر پر ترجیح دیتا ہے۔ اس صورت حال میں وہ کبھی دعوت کی بنیاد پر غیر کو اپنا کر اس سے محبت واخوت کا رشتہ قائم کرنے پر راضی نہ ہوگا۔ بغض، حسد، کینہ، مسابقت جیسے اقدارِ رذیلہ اس کے بنیادی اوصاف اور اقدار بنتی چلی جائیں گی......قوم پرستی اور سرمایہ داری دونوں ہی نفس کی پراگندگی کو ابھارتی ہیں اور بغض، حسد، مسابقت کو انسان کا فطری جذبہ قرار دیتی ہیں اور اپنی قوم کے لیے زیادہ سے زیادہ مادی مفادات اور ان کے عروج وبرتری کو جائز اور فطری سمجھتی ہیں۔

قومیت کے عناصرِ ترکیبی:

قومیت کے عناصرِ ترکیبی کی بہت سی جہتیں ممکن ہیں جو قومیت کے بت کی عصبیت کو پروان چڑھانے میں معاون ومددگار ثابت ہوتے ہیں۔ مثلاً

۱......اشتراکِ وطن (آریائی وغیر آریائی)

۲......اشتراکِ وطن (ایرانی وتورانی)

۳......اشتراکِ زبان (سندھی، پشتو، فارسی وغیرہ)

۴......اشتراکِ رنگ (سفید اور کالی رنگت)

۵......معاشی مفادات کا اشتراک (G8، یورپی یونین وغیرہ، وسارک ممالک کے لوگ، آسیان ممالک)

۶......جغرافیائی حدود واشتراک (مثلاً کشمیر وامریکا وغیرہ)

۷......سیاسی قومیت (نظامِ حکومت کا اشتراک مثلاً سنگاپور، روس)

لہٰذا جو قومیتیں ان بیان کردہ عصبیتوں کی بنیاد پر تعمیر ہوتی ہیں ان میں اپنے اور غیر کے مقابل مسابقت ومزاحمت اور مناقشت ایک دائمی شکل اختیار کرتی چلی جاتی ہے اور ایک دوسرے کو پامال کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور باہم فساد، بدامنی اور شرارت کا ایک مستقل سرچشمہ ثابت ہوتے ہیں لہٰذا رنگ ونسل، زبان وعلاقہ پر مبنی امتیازات انسان کو ننگی جارحیت میں مبتلا کر کے حق وانصاف سے بے گانہ بنا دیتے ہیں۔ تاریخ عالم میں فرعون وہ پہلا شخص تھا جس نے عصبیت کی بنیاد پر قبطی اور غیر قبطی کی تفریق مقرر کی اور آلِ یعقوب کو بے دریغ قتل کیا۔

قوم پرستی کے اسباب وعلل:

قوم پرستی یعنی نیشنلزم بنیادی طور پر ایک مغربی مظہر ہے جس کی اپنی تاریخ ہے۔ یہ تاریخ بتاتی ہے کہ مغرب نے کس طرح مذہبی اجتماعیت اور کلّیت کو رد کر کے قومیت اور قومی مملکتیں تخلیق کیں۔ مغربی اقوام نے کولونیل ازم (نوآبادیات) کے جذبۂ رقابت کے تحت دنیا میں جس سفا کی اور شیطنت کا مظاہرہ کیا اس کا جواز مذہبی تاریخ اور مذہبی ریاست کے ضمن میں ممکن نہ تھا۔ قوم اور قومی مملکت اس لوٹ مار سفّا کی اور شیطنت کو جائز قرار دیتی ہے۔ قوم پرستی کو فی زمانہ تین اکائیوں میں توڑ کر دیکھا جاتا ہے۔

۱......ریاستی قوم پرستی

۲......غیر ریاستی قوم پرستی

۳......اجداد پرست قوم پرستی

ریاستی قوم پرستی:

ریاستی قوم پرستی وطن پرستی کے نظریات سے ہم آہنگ ہوتی ہے، جس میں ریاست کے تقدس کو اوّلیت حاصل ہوتی ہے مثلاً کانگریس کے نظریات میں ہندوستانی وطنیّت کے تقدس کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

غیر ریاستی قوم پرستی:

غیر ریاستی قوم پرستی مقبولِ عام نعروں کے ماتحت اپنے وجود کا اظہار مذہبی، اخلاقی، عمرانی اور علاقائی حقوق کی صورت میں کرتی ہے، مثلاً ترک قوم پرستی جہاں انفرادی آزادی اور انفرادی جمہوریت کو کم وقعت حاصل ہے بالمقابل ترک جذبات اور تکبر اور برتری کے۔

اجداد پرست قوم پرستی:

اجداد پرست قوم پرستی بلا امتیاز جز مشترکہ زبان، مشترکہ ثقافت، آباء واجداد کے نسلی تفوق پر قائم ہوتی ہے۔ اس کے تحت کوئی ریاست اپنی وجہ جواز اور سیاسی حیثیت کو انہی بے نسلی، مادر ملی پر مبنی جذبات کی بنیاد پر استوار کرتی ہے اور اس کو اپنی ثقافت اور معاشرت قرار دیتی ہے اور اپنی خاص جغرافیائی حدود کے باہر ہر نسل، قوم کو غیر سمجھتی ہے، مثلاً سعودی عرب، چین، اسرائیل، آریائی ہندوستان۔

قوم پرستی کی نامیاتی ترکیب:

۱......نسلی رگروہی قوم پرستی

۲......توسیع پسندانہ قوم پرستی

۳......رومانوی قوم پرستی

۴......ثقافتی قوم پرستی

۵......تیسری دنیا پر مبنی قوم پرستی[Third world nationalism]

۶......لبرل قوم پرستی

۷......انارکسٹ قوم پرستی

۸......مذہبی قوم پرستی

۹......پان قوم پرستی

۱۰......متفرق قوم پرستی[Diasposa Nationalism]

۱۱......غیر ریاستی قوم پرستی[Stateless Nationalism]

قوم پرستی کا بنیادی اصول:

قوم پرستی دو بنیادی اصولوں پر کارفرما ہے اس کا ایک آفاقی دعویٰ ہے۔ اس دعویٰ کے تحت اپنی قوم کو دوسری قوم کے مدِ مقابل رکھ کر دیکھتی ہے کہ اس کی قوم کا اقوامِ عالم میں کیا مقام ہے اور اپنی قوم کے تفوق اور برتری کو کس طرح قائم کیا اور رکھا جا سکتا ہے اور اس کے برتر واعلیٰ قوم ہونے کے شرف کو کس طرح ثابت کیا جا سکتا ہے۔ اور مدِ مقابل قوم کے مفاد اور اس کے مادی حصول کو کون سے ذرائع و وسائل سے حاصل کیا جا سکتا ہے اور ان مقاصد کے حصول کے لیے دنیا کی ترتیب اور ترکیب کیا ہونی چاہیے۔ قوم پرستی کی آمیزش بحیثیت ایک انفرادی قوم کے ایک خاص تخصیص پر قائم ہوتی ہے، جو اس کے مقامی اور آفاقی تصور اور دعویٰ کو ایک دوسرے سے جوڑے رکھتی ہے۔ اس ترکیبِ نو پر قوم پرستی اپنے نظریات کے تانے بانے بنتی ہے مثلاً ہندی ہندوؤں کی زبان ہے۔ جو تمام زبانوں میں پوتر یعنی اعلیٰ اور ارفع ہے۔ لہٰذا ہر ہندوستانی کو ہندی بولنا چاہیے اور ہندوستان کی قومی زبان ہندی ہونا چاہیے۔ اردو ایک غیر ملکی زبان ہے جو مسلمانوں کی زبان ہے اور مسلمان دیگر بلادِ اسلامی سے آکر یہاں آباد ہوئے ہیں یہ سب غیر ملکی ہیں اور ان کی زبان ملیچھ (ناپاک) ہے۔ یعنی قوم پرستی کی آمیزش و ترکیب کا نقطہ آغاز دیگر اقوام کا مدمقابل قوم کے موجد ہونا اور سرمایہ دارانہ مفادات کی ترکیب اپنی قوم کے حق میں استعمال کرنا۔ یعنی قوم پرستی قائم ہوتی ہے مدمقابل قوم سے حرص، حسد، بغض اور مقابلے کی کیفیت سے......اسی کیفیت نے زمانہ جدید میں قوم پرست ریاست، قوم پرست سیاست، قوم پرست معیشت و معاشرت کی تشکیل کی ہے، حتی کہ مذہب کو بھی قومیا لیا گیا ہے اور مذہب کے آفاقی تصور کو قوم کی سطح تک محدود کر دیا گیا ہے۔ مثلاً تبّتی بدھ ازم جو صرف تبت کی ریاست تک محدود ہے۔ مذہبی لحاظ سے تبّتی بدھ ازم ریاست تبت کی جغرافیائی حدود سے باہر نکل نہیں سکتا۔ نتیجتاً دلائی لامہ کا بدھ ازم اور بدھ قوم دونوں ہی ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ ہمارے ہاں سعودی حکومت بھی آلِ سعود تک محدود ہے اور ایک خاص قسم کے اسلام یعنی وہابیت کے تقدم و تفوق کا پرچار کرتی ہے۔ جغرافیائی ترتیبِ نو مخصوص زبان ثقافت اور اقدار کی تحدید نے ہر قوم کو دوسری قوم کے مدمقابل لا کھڑا کیا ہے۔ آزاد ریاست آزاد قوم کے نعرہ ہائے مستانہ ہر طرف گونجنے لگے۔ قومی ریاست قوم کی فلاح و قیام اور حفاظت کی امین سمجھی جانے لگی۔ قوم پرست ریاست نے جہاں قوم پرستی کو پروان چڑھایا وہیں وطن پرستی کے جذبے کو بھی فروغ دیا اور مذہب کو قومیا کر مذہب کی آفاقیت کو مقامیّت میں دفن کر دیا حتیٰ کہ فی زمانہ غیر قومی ریاست کا قیام (طالبان کی ریاست، ریاست اسلامیہ افغانستان، چیچنیا کی ریاست) غیر قانونی اور ناجائز تصور کیا جاتا ہے اور تمام سرمایہ دارانہ قومی ریاستیں غیر قومی ریاست پر گِدھوں کی طرح ٹوٹ پڑتی ہیں کیوں کہ غیر قومی ریاست، سرمایہ دارانہ قومی ریاستوں میں اجنبی ہوتی ہے۔ لہٰذا ہم تاریخی طور پر یہ دیکھتے ہیں کہ ابتداء جتنی بھی قومی سیاسی جدوجہد مغرب سے لے کر مشرق تک ہوئی ہے وہ سب غیر قومی ریاستوں کے خلاف ہوئی ہے اور اس کے نتیجے میں قومی ریاست کا ظہور ہوا۔ مثلاً عثمانی سلطنت کا خاتمہ عرب قومی ریاستوں اور موجودہ ترک ریاست کا باعث بنا۔ زار کی حکومت، اسپین اور آسٹریلیا فرانس اور ہنگری کی بادشاہتوں کا خاتمہ وغیرہ سب ہی اس قومی سیاسی جدوجہد کا نتیجہ ہیں۔ بلادِ اسلامیہ میں حجاز کو ختم کر کے، سعودی قومی ریاست کا ظہور ہوا اور عرب کو عرب حق پرستی کے نام پر تقسیم در تقسیم کر دیا گیا۔ 19 ویں صدی کی تمام ریاستیں سرمایہ داری کے مکر و فریب کا شاخسانہ ہیں۔ قومی شناخت، قومی کلچر، قومی سرمایہ، قومی دولت، قومی ریاست اور جغرافیائی حدود، قومی اقدار، قومی حفظِ مراتب، قومی دستور، ری پبلک سب کا حدود اربعہ سرمایہ داری کا مرتب کردہ اور ترتیب دیا ہوا ہے۔ قومی سیاست اور قوم پرستی سرمایہ داری کی پرستش ہی کا نام ہے، جیسا کہ مشہور مغربی مفکر ارنسٹ گیلنر کہتا ہے، قوم، قوم پرستی اور قومی ریاست دراصل ماڈرنائزیشن اور انڈسٹریلائزیشن کے ماتحت سرمایہ داری پر ایمان اور جدید پریس میڈیا کے قیام کا ہی نتیجہ ہیں۔

یہاں پر یہ بات بھی گوش گزار کرانا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مغرب سے آیا ہوا ہر رویہ، ہر نظریہ اور ہر تحریک تعمیر سے عاری ہے۔ مغربی فکر کو اپنانے اور اس پر عمل کرنے کے نتیجے میں فرد، معاشرہ اور ریاست مسلسل تخریب کے عمل سے گزرتی ہے۔ چنانچہ جہاں بھی قوم پرستی خواہ مسلم قوم پرستی کی شکل میں ہو یا ہندو قوم پرستی کی شکل میں وہ اسی شاخِ نازک کو کاٹنے کے درپے ہوتی ہے جس پر اس کا آشیانہ ہوتا ہے۔ دیکھئے، اسی مسلم قوم پرستی کی کوکھ سے بنگلہ قوم پرستی نے سر نکالا اور پاکستان تقسیم ہو گیا (شیخ مجیب پہلے مسلم لیگی تھا)، جی ایم سید نے سندھی قوم پرستی کا نعرہ دیا وہ بھی پہلے مسلم لیگی تھا اور تحریک خلافت کا بڑا فعال کارکن تھا، آج خیبر پختونخواہ بنا تو ہم دیکھتے ہیں کہ مانسہرہ اور ہزارے والے تصادم کے نزدیک پہنچ گئے ہیں۔ عنقریب ہو سکتا ہے کہ کوہستان صوبے کی بھی بات چلے، مزید تقسیم در تقسیم کا عمل ہو......اسی طرح ہندوستان میں ہندو قوم پرستی کی کوکھ سے وہاں آسام، ناگالینڈ، منی پور، تری پور، اروناچل پردیش وغیرہ کی علیحدگی کی تحریکیں چل رہی ہیں۔

قوم پرستی وہ آسیب ہے جو اپنی ماں کا پیٹ پھاڑ کر برآمد ہوتی ہے اور بعد ازاں اپنی ماں اور اپنے بھائی بہنوں سب کو نگل جاتی ہے...... خوں ریزی، خوں آشامی، قتل و غارت گری کا ایک نہ رکنے والا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ایسے میں جمہوریت، دستوریت، سرمایہ داری امن کا پیغام دیتی ہے یہ پیغام امن و آشتی کا نہیں بلکہ ظلم اور جبر، حرص و حسد کو مزید پروان چڑھانے کا باعث بنتی ہے۔

سوک نیشنل ازم (مدنی قومی پرستی):

اس کے تحت ایک ایسی قوم رمدنی ریاست کی تشکیلِ نو کی جاتی ہے جس میں اس کے شہریوں کی متحرک شمولیت کو ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اور ریاستی امور کو لوگوں کی شخصی، نفسی اغراض یعنی [Will of people] کے آفاقی جذبوں کے ماتحت استوار کیا جاتا ہے۔ لہٰذا مدنی قوم پرست ریاست

میں عقلیت پسندی، لبرل ازم کو تقدس حاصل ہوتا ہے اور اس کا معیارِ اخلاق نمائندہ حکومت، نمائندہ جمہوریت کو قرار دیا جاتا ہے۔ شخصی آزادی کے ماتحت کیپٹل ازم پر ایمان کو استوار کیا جاتا ہے اور سرمایہ دارانہ حقوق کو ہر شے پر مقدم قرار دیا جاتا ہے۔

توسیع پسندانہ قوم پرستی:

یہ قوم پرستی کی ایک ریڈیکل شکل ہے جس میں وطن پرستی رحب الوطنی کے جذبے کو توسیع پسندانہ عزائم کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً نازی ازم، نیشنلسٹ، سوشل ازم وغیرہ مثلاً ہٹلر کا جرمنی اور سربیا کا خونی قاتل میلاسووچ......

رومانوی قوم پرستی:

رومانوی قوم پرستی کو نامیاتی قوم پرستی اور شناخت پر مبنی قوم پرستی بھی کہا جاتا ہے اس کے تحت کوئی ریاست اپنے سیاسی وجود اور جواز کو قوم کے اظہار کا ایک طریقہ سمجھتی ہے۔ رومانوی قوم پرستی اپنے تاریخی ورثہ، کارناموں، واقعات، حالاتِ کار، زندگی اور حالات، تاریخی حالات و واقعات سے مثلاً تنویر کی عقلیت پسندی، فرانسیسی قوم کی رومانوی تاریخ مثلاً رینساء، ہندوتوا کی گیتا کے گرد ریاست کی تشکیل وغیرہ۔

ثقافتی قوم پرستی:

اس کے ماتحت قوم کی تعریف مشترکہ کلچر کے ذریعے متعین کی جاتی ہے اس کی ممبر شپ نہ تو مکمل طور پر رضا کارانہ ہوتی ہے اور نہ ہی اجداد کے تعلق سے۔ کوئی بھی فرد چند بنیادی لوازمات کو پورا کر کے اس کو اپنا سکتا ہے۔ مثلاً یورپی یونین، ہندوستان میں ایک مسلمان ہندی زبان، ہندی تاریخ وورثہ کو اپنا کر ہندوستانی کلچر کا حصہ بن سکتا ہے۔

تیسری دنیا اور قوم پرستی:

اس کو تھرڈ ورلڈ ازم بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے تحت تیسری دنیا کے ممالک اپنے معاشی مفادات کے تحفظ کے لیے اور اپنی معاشی بقا کے لیے حکمتِ عملی کے طور پر نو آبادیاتی، سامراجی پالیسیوں کے خلاف ایک پلیٹ فارم پر صف آرا ہوتے ہیں تاکہ سامراجی اقدامات سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکیں اور نو آبادیاتی قوتوں کے خلاف مشترکہ قومی مفادات کو اپنا سکیں مثلاً غیر جانبدارانہ تحریک، آسیان، سارک، جی 10، جی 18 اور آئی سی وغیرہ۔

لبرل نیشنل ازم:

اس قسم کی قوم پرستی کے ذریعے فرد کی خواہشات اور اس کی تکمیل کو سفلی جذبوں کے تحت ابھارا جاتا ہے۔ اور انسانیت پرستی کو مہمیز فراہم کی جاتی ہے۔ اور جمہوریت کو ہر سیاسی مرض کا ویکسین قرار دیا جاتا ہے تاکہ فرد کی زندگی کو زیادہ سے زیادہ لذت انگیزی سے ہمکنار کیا جا سکے...... آزادی، ترقی، مساوات، انفرادی حقوق کو خصوصی اقدار کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔

انارکسٹ نیشنلزم:

انارکسٹ نیشنل ازم کے تحت فرد کو قوم پر تفوق حاصل ہے لہٰذا فرد کو کسی ریاستی حدود و قیود میں مقید کرنا ایک غیر فطری عمل ہے۔ ریاست اپنی ترجیحات، قانون اور قوت کے بل بوتے پر قوم و فرد پر مسلط ہو جاتی ہے اور ریاست فرد کی انفرادی صلاحیتوں کو کچل دیتی ہے۔ چنانچہ ریاست قوم کی بھی خواہ کبھی نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا ایک ایسا سیاسی نظام تشکیل دیا جائے جہاں پر ہر چیز لوکل کنٹرول میں ہو، فیڈریشن سے آزادی ہو، امداد باہمی ہو یعنی فرد کو قوم پر اور قوم کو ریاست پر برتری حاصل ہو۔

غیر ریاستی قوم پرستی:

کسی بھی قوم پرستانہ سیاسی تحریک کا بنیادی مؤقف اپنی قوم کے لیے ایک ریاست کا قیام ہے جو کہ بسا اوقات غیر ریاستی قوم پرستی کو جنم دیتی ہے۔ مثلاً ہندوستان کے قیام کے بعد ہندوستان میں مختلف ریاستوں کے اندر سیاسی جدوجہد کو اسی دائرہ کار کے اندر رکھ کر دیکھا جا سکتا ہے۔ اقلیتی قوم اور اقلیتی کلچر اکثریتی قوم کی ریاست کے اندر اپنے آپ کو دبا ہوا اور پسپا ہوا محسوس کرتی ہے۔ فلسطینی جدوجہد کو یہودی ریاست کے قیام کے بعد سے اسی تناظر میں بیان کیا جاتا رہا ہے۔ حال ہی میں مختلف بلادِ اسلامیہ میں جو مسلح جدوجہد ابھر کر سامنے آئی ہے، اہل مغرب اس کو انتہا پسندی اور ٹیرازم سے تعبیر کرتے ہیں اور اکیڈمک طور پر اس جدوجہد کو غیر ریاستی سیاسی عنصر کے طور پر بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ قومی ریاست سے باہر جا کر جو بھی جدوجہد کی جائے گی اس کو اہل مغرب اور اس کے مفکر ناجائز قرار دیتے ہیں اور جدید دنیا کے منظرنامے پر ایک نئے عنصر کے طور پر لیتے ہیں جو اپنی جدوجہد کو سرمایہ دارانہ عمل اور قومی ریاست کے باہر تشکیل نوع کرنے کی پیہم جدوجہد کر رہی ہے، لہٰذا جو بھی جدوجہد قومی ریاست اور سرمایہ دارانہ عمل کے باہر ہو گی اہل مغرب یقیناً اس کو انتہا پسندی قرار دیں گے۔

انتہا پسندی:

ہر وہ عسکری اور سیاسی جدوجہد جو جدید قومی ریاست اور سرمایہ دارانہ عمل کی ترکیب اور ترتیب کے خلاف عمل پیرا ہو اہل مغرب اس کو انتہا پسندی قرار دیتے ہیں۔ دراصل مغرب سمجھتا ہے کہ اسلامی دنیا اور اس سے باہر ہونے والی اسلامی جدوجہد قومی ریاست، قومی سرمایہ دارانہ عمل اور سرمایہ کے عالمی غلبہ کے مخالفانہ رویوں کا دوسرا نام ہے۔

اوپر بیان کردہ قوم پرستی کی جو نامیاتی ترکیب اور ترتیب بیان کی گئی ہے اس دائرہ کار میں رکھ کر ہم ہندو قوم پرستی اور مسلم قوم پرستی کا برصغیر میں جو ظہور ہوا ہے اس کا موازنہ اور تجزیہ کرنے کی کوشش کریں گے۔

ہندو قوم پرستی:

اوپر جو قوم پرستی کی اقسام بیان کی گئی ہیں اس دائرہ کار میں ہندو قوم پرستی دراصل ثقافتی قوم پرستی لبرل نیشنل ازم اور رومینٹک نیشنل ازم کا ملغوبہ ہے جس میں آپ کسی حد تک مذہبی قوم پرستی کو بھی شامل کر سکتے ہیں۔ یعنی ہندو قوم پرستی کے تحت ریاست ایک خاص نسل، گروہ کے حقوق اور سیاسی بقاء کے اظہار کی تاریخی طور پر فطری لحاظ سے وارث ہے۔ لہٰذا ہندو ریاست کا قیام ہندو قوم کی بقا کے لیے ضروری ہے جہاں وہ اپنی لوک روایات، لوک رسوم و رواج، لوک اعتقادات، لوک داستانوں کا اظہار کرنے میں آزاد ہوں۔

ہندو قوم پرستی کا دعویٰ ہے کہ ہندو مشترکہ کلچر اور ہندوستان میں بسنے والی دیگر اقوام اگر ہندو روایات ہندو کلچر اور ہندو تاریخ کو اپنا لیتی ہیں تو وہ بھی ایک خاص درجے میں ہندو قوم کا حصہ ہیں۔

فی زمانہ ہندو قوم پرستوں نے تمام لبرل اقدار، آزادی، رواداری، مساوات، انفرادی حقوق اور قومی شناخت کو اپنا لیا ہے اور پر تعیش لذت انگیز زندگی گزارنے کے بھی داعی ہیں لہٰذا ہندو قوم پرستی کوئی پرانی تاریخی چیز نہیں بلکہ جدید سیاسی تاریخ کا حصہ ہے۔ جس کے تحت قومی ریاستیں وجود میں آئیں...... آئیے اب ہندوتوا کے تحت ہندو قوم پرستی کی تفصیل کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہندو نیشنل ازم کو سمجھنے کے لیے ہندوتوا کو سمجھنا ضروری ہے۔ ہندوتوا ہندو نیشنل ازم ہی کا دوسرا نام ہے۔

ہندوتوا Hindu tiva:

ہندو سیاست ہندوستان میں ہندوتوا کے ساتھ جڑی ہوئی ہے مختلف ہندو سیاسی جماعتوں کے مجموعے کو ہندوتوا کہا جاتا ہے ہندوتوا مندرجہ ذیل سیاسی ہندو پارٹیوں کے مجموعے کا نام ہے۔

۱...... بھارتیہ جنتا پارٹی

۲...... شیوسینا

۳...... آکھل بھارتیہ ہندو مہاسبھا

۴......بھارتیہ جن سنگھ

۵......رام راج پریشد

۶......وشوا ہندو پریشد

۷......بجرنگ دَل (سکھ پارٹی)

۸......راشٹر یا سوایام سیوک سنگھ

ہندوتوا کے ماتحت اوپر بیان کردہ سیاسی پارٹیوں کے لیڈروں کا ہندو قوم پرستانہ سیاست میں ایک خاص مقام ہے اور تمام سیاست ان ہی لیڈروں کے اردگرد گھومتی ہے۔

......بال گنگا دھر تلک

......پنڈت مدن موہن مالویہ

......ویناٹک دامودار ساورکر

......مدھو ساداشو گول واکر

......کشوا بلی رام ہجوار

......سائمہ پرشاد مکرجی

......دیندیپال آپادھیایا

......بال ٹھاکرے

......واجپائی وغیرہ

ہندوتوا کی سیاست:

ہندوتوا اپنی سیاست کی بنیاد مذہب پر استوار کرنے کے مخالف ہیں گو کہ وہ ہندو مذہب کے بنیادی آورشوں کی انفرادی زندگی میں بجا آوری پر زور دیتے ہیں۔ ہندوتوا والے مذہب سے زیادہ سیکولرازم پر ایمان رکھتے ہیں۔ اسی لیے وہ مذہب کو ریاستی عمل سے باہر سمجھتے ہیں اور ریاستی سیاست (جمہوریت) میں وہ ہندو نیشنل ازم کو ایک قوتِ متحرکہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور ہندو نیشنل ازم کو بطور آئیڈیالوجی کے استعمال کرتے ہیں۔ ہندوتوائی جدید ہندوستانی ری پبلک کو ہندو راشٹریہ یعنی ہندو ریاست کے علی الرغم سمجھتے ہیں اور ری پبلک آف انڈیا کو ہندو ورثہ اور اس کی خود ساختہ تاریخ کی حفاظت کی امین سمجھتے ہیں......جیسے کہ بھارتیہ جنتا پارٹی (بی جے پی) اپنے لٹریچر اور اس کے سلوگن میں ہندو راشٹریہ یعنی جدید ہندو ریاست کے قیام کو اپنا بنیادی نظریہ قرار دیتی ہے۔ بی جے پی والے اسی ہندو راشٹریہ کے دائرے میں بدھ ازم، جین ازم اور سکھ ازم کو بھی بیان کرتے ہیں اور ان مذاہب کے ماننے والوں کو بھی ہندو قرار دیتے ہیں۔ جبکہ بدھ ازم، جین ازم اور سکھ ازم کے پیروکار اپنے آپ کو ہندوؤں سے الگ سمجھتے ہیں۔

چنانچہ ہندوتوا والے اپنی سیاست کو وسعت دینے کے لیے مذہب کو اپنی سیاست سے جدا قرار دیتے ہیں اور اپنی جدوجہد کو خالصتاً ہندو نیشنل ازم کا امین سمجھتے ہیں جس کا بنیادی مقصد ہندو راشٹریہ یعنی ہندو ریاست کا قیام ہے۔

ہندوتوا کیا ہے؟

ہندوتوا کا نظریہ کوئی پرانی چیز نہیں ہے اس کا ظہور بیسویں صدی میں ہوا۔ ہندوؤں کی طرف سے جنگِ آزادی کا ہیرو جس کا نام ویناٹک دامودار تھا عوام میں ویر ساورکر کے نام سے جانا جاتا تھا اس نے انگریز کی اسیری کے دوران جیل میں ایک کتاب لکھی جس کا نام ہندوتوا تھا۔ بھگوا گیتا کو ہندو مذہب میں بائبل کی حیثیت حاصل ہے اسی طرح ہندوتوا کی کتاب کو جدید ہندوستان میں ہندوتاریخ، ہندو ورثے، ہندو نسل اور ہندو نیشنل ازم پر حرفِ آخر سمجھا جاتا ہے، یاد رہے ہندوتوا کی کتاب مراٹھی زبان میں لکھی گئی۔ ویر ساورکر کے مطابق ہندتوا کا مطلب ہندوستانی ہونا ہے، جس کو وہ ''ہندو پن'' Hinduness کہتا ہے۔ Hunduness کا مطلب اور مقصد ہندو ورثے اور تہذیب کی حفاظت ہے اور ہندو طرز رہائش یعنی Hindu Way of Life کو اختیار کرنا ہے۔ ساورکر کے مطابق ایک ہندو اپنے ہندو پن کو چھوڑے بغیر کسی غیر ہندو مذہب کا پیرو ہو سکتا ہے اور اپنی ہندوانہ روش پر قائم رہتے ہوئے دوسرے خدا یا خداؤں کی پرستش بھی کر سکتا ہے گو کہ اس کا یہ عمل ناقص ہوگا لیکن غلط یا قابلِ اعتراض نہیں گردانا جاسکتا، لہٰذا اسی کثیر جہتی ہما ہمی کی بنیاد پر ان ہندو پن والوں کو انسانیت دوست دنیا کو کامیابی کی طرف لے جانے والے اور امن و آشتی کا گہوارا بنانے کے لیے ایک دوسرے کی مدد اور قوت فراہم کرنے والے ہندو توا دنیاوی بھلائی اور فلاح کے لیے، نہ صرف ہندوازم کی بھلائی اور صلح چاہتا ہے بلکہ وہ سکھ ازم، بدھ ازم اور جین ازم کو بھی وقعت کی نگاہ سے دیکھتا ہے، اسی وجہ سے وہ کہتا ہے کہ ہندوتوائی سب سے بڑھ کر سیکولر اور روادار ہوتا ہے۔

گاندھی کی شخصیت کی بنا پر ہندوتوا کی تحریک نے آزادی کے بعد خاصے عرصے تک قبولیّت عامہ حاصل نہ کی لیکن 1980ء میں اس کو پذیرائی ملنا شروع ہوئی اس دور میں دو بنیادی عوامل نے ہندوتوا کو ہندوستان کے عوام میں پذیرائی عطا کی۔ راجیو گاندھی کے دورِ اقتدار میں پارلیمنٹ نے مسلمانوں کے خلاف سپریم کورٹ کے دیئے ہوئے فیصلے کو تبدیل کیا۔

بابری مسجد کا کیس، بابری مسجد کی شہادت اور اس کے گرد ہونے والی عوامی سیاست نے بی جے پی کو عوام میں قبولیت عطا کی اور اس کو عالمی پذیرائی بھی بخشی۔

ہندو نیشنل ازم کی تاریخ:

ہندوتوائی اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ ہندو نیشنلزم کا آغاز 8ویں صدی عیسوی سے ہوتا ہے جب مسلمان حملہ آور ہندوستان آنا شروع ہوئے۔ لہٰذا ہندوؤں نے بنیادی طور پر ان حملہ آوروں سے اپنی ریاست کو بچانے اور دھرم کو محفوظ رکھنے کی جدوجہد شروع کی۔ اس مقصد کے لیے تاریخی طور پر ہندوؤں نے جس اصطلاح کو استعمال کیا جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے اس کو ہندوتوائی کشٹیریا، یعنی *تحفظ دھرم / تحفظ ریاست* کہتے ہیں۔

ہندوتوائی کہتے ہیں کہ یہ کشٹیر یا بذاتِ خود نیشنلزم ہی ہے، لہٰذا ہندو عوام، ہندو دھرم، ہندو ریاست کا قیام، ہندوتوا یا ہندو نیشنلزم کے ساتھ منسلک ہے، اسی لیے ہر ہندوستانی کو ہندوستانی ریاست کا وفا شعار ہونا ضروری ہے۔ ساورکر اس وفا شعاری کو ہندو راشٹرا یعنی ہندو ریاست کا نام دیتا ہے اور بطور ایک ہندوستانی تمام ہندوستانیوں کو ہندو مذہب کے ساتھ ہندو روایات کے ساتھ ہندو تہذیب و اقدار کے ساتھ ساتھ ہندو ریاست کا پاسبان ہونا ضروری ہے۔ اور ان تمام اقدار و روایات کو ریاست کی تعمیر کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔

ہندو راشٹرا کیا ہے:

ہندو راشٹرا کی تکرار تمام ہی سنگ پری وار پارٹیوں میں ملتی ہے سنگ پری وار پارٹیوں میں سے ایک پارٹی کا نام ہی راشٹریا ہے جس کو RSS یعنی راشٹریا سوا سیوک سنگھ پارٹی کہتے ہیں۔ (RSS (National Votunteer Organization اپنے آپ کو ایک والنٹیر آرگنائزیشن کہتے ہیں۔ اس کا ایک اور نعرہ سنگھٹ ہندو سمار تھا بھارت یعنی یونائیڈ ہندو اور کیپ ایبل انڈیا ہے، راشٹریا والے روزانہ کھلی جگہوں پر اپنا اجتماع منعقد کرتے ہیں۔ جہاں بچے عورتیں مرد ایک ساتھ جمع ہو کر فوجی طرز کی مشقیں کرتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ سارے بھارت میں روزانہ ان کے اس طرح کے پانچ ہزار اجتماعات ہوتے ہیں۔ وشوا ہندو پری شد اس کی ایک سسٹر تنظیم ہے جس کا مقصد ہندوستان سے باہر ہندوؤں کے لیے کام کرنا ہے۔ آر ایس ایس والوں کا دعویٰ ہے کہ ہندوستان نے ساری دنیا کو سیکولرازم، سویلائزیشن، علم ہندسہ سکھائی، مزید برآں ان کا دعویٰ ہے کہ محمدؐ ان

(مسلمان) بھی ہندو ہی ہیں۔ یہ لوگ بھی ہندوستان کے باسی ہیں اور ہوسکتا ہے کہ مستقبل قریب میں ہندوستانی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہم سب مل کر مذہبی تعصب اور مذہبی کٹرپن سے گلوخلاصی حاصل کرلیں اور مذہب کی جگہ ایک ایسی انسانی ریاست کا قیام عمل میں لائیں (ہندو ریاست) جہاں مذہب کا کوئی ریاستی عمل دخل موجود نہ ہو۔

ہندوقوم ہندوستان میں ہمیشہ سے تھی اور مستقبل میں بھی ہمیشہ رہیں گے اور ہندو ہندوستان میں مسلمان اور عیسائی کی طرح باہر سے حملہ آور نہیں ہوئے، لہٰذا ہندو راشٹرا کا خیال اور قیام سیکولرازم اور جمہوریت سے قطعی متصادم نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ فطری طور پر متعلق ہے، لہٰذا ہندوتوا کی اصطلاح احاطہ کرتی ہے تمام ہندوستانی ثقافت کا بالخصوص ان ہندوستانیوں کا جن کے آباواجداد ہندو تھے، لہٰذا مسلم اور عیسائی ہندوستانی بھی ہندو ہیں جن کے اجداد ہندو تھے۔ لہٰذا عیسائی اور مسلم مذہب سے قطع نظر ان کا ورثہ اور ان کی تہذیب ہندوستانی ہی ہے۔ اسی دائرہ کار میں رہتے ہوئے اکھنڈ بھارت یعنی Complete india کی یہی تفسیر ہے۔ ہندوستان کی تقسیم نے ہندوستان کی منفرد تاریخ، ثقافت، ورثے کو بری طرح متاثر کیا اور یہ تقسیم غیر فطری ہے۔

ہندو راشٹرا کی وکالت کرنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ ہندوازم میراث ہے۔ Tolerance یعنی رواداری، مختلف النوع فلاسفی اور اصلاح پسند تحریکات کی اس لیے ہندوتوا والے کہتے ہیں کہ ہم ایک عالمی بھائی چارے، عالمی رواداری کے امین ہیں اسی لیے ہندوستان کا ہر فرد ہر طبقہ اور ادارہ ہندوستان میں دائمی طور پر ہندوتہذیب سے جڑا ہوا ہے۔ اسی لیے ہندو کی اصطلاح ایک کُل پر مبنی ہے اور یہ احاطہ کرتی ہے تمام ادیان اور فلسفوں کا جس میں سکھ، جین، بدھ تمام ہی شامل ہیں! آر ایس ایس والے کہتے ہیں کہ راشٹرا کا ترجمہ ہندوقوم درست نہیں ہے بلکہ اس کا درست ترجمہ ہندو ریاست اور ہندوپن ہے۔

وشواہندو پری شد:

یہ آر ایس ایس کی ایک برادر تنظیم ہے۔ VHP کی تنظیم سازی 1967ء میں ہوئی، اس کے تحت بہت سے آر ایس ایس لیڈروں اور کچھ مذہبی پنڈتوں نے مل کر ہندو مذہب، ہندو روایات اور ہندو کو از سرنو تعمیر (Revive) کرنے کا کام شروع کیا۔ VHP وہ تنظیم ہے جس نے رام جنم بھومی (بابری مسجد) کا ایشو سارے ہندوستان میں عام کردیا اسی کے بطن سے اکھل بھارتیہ ویدھیارتیا پری شد نے جنم لیا جو اس وقت ہندوستان کی سب سے بڑی طلبہ تنظیم ہے۔ وی ایچ پی مزدوروں اور کسانوں میں بھی کام کرتی ہے۔

بھارتیہ جنتا پارٹی BJP:

بھارتیہ جنتا پارٹی کو عموماً RSS کا پولیٹیکل ونگ سمجھا جاتا ہے، بی جے پی کا پرانا نام بھارتیہ جن سنگھ ہے جس کا سنگِ بنیاد سیامر پرساد مکھرجی نے 1951ء میں رکھا۔ 1980ء میں بدل کر بی جے پی بنی...... اٹل بہاری واجپائی اور لال کرشنا ایڈوانی اس کے مشہور لیڈر ہیں، وفاق کی سطح پر بی جے پی نے 1996ء میں حکومت حاصل کی لیکن صرف 13 دن میں ان کی حکومت ختم ہوگئی۔ 1998ء میں بی جے پی نے دوبارہ حکومت سازی کی۔ 2001ء یہ دوبارہ انڈین کانگریس سے شکست کھا گئے۔ صوبہ گجرات، راجھستان، چھتیس گڑھ، کرناٹکا، بی جے پی کے مضبوط گڑھ ہیں۔

ہندو نیشنلزم میں ہندودھرم سے زیادہ ہندو بادشاہوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے جس میں پرتھوی راج اور سیواجی مہاراج کو اہم مقام حاصل ہے کیوں کہ ان کا بنیادی مسئلہ ہندو مذہب نہیں بلکہ ہندو ریاست ہے۔ اسی لیے ایک ہندو تنظیم شیوسینا کا نام ہی سیواجی مہاراج نام کے اوپر ہے، (سیواجی کی ساری جدوجہد ریاست کے حصول کے گرد گھومتی ہے) اس سیاسی پارٹی کا اثرورسوخ بھارتی صوبے مہاراشٹرا میں بہت زیادہ ہے۔

ہندوتوا کا مرکزی خیال (Central Concept): ہندوتوا کے مطابق برصغیر میں ہمالیہ سے لے کر کوہ ہندوکش تک اکھنڈ بھارت ہے جو کہ ہندوؤں کا ہوم لینڈ ہے۔ ہندو صرف وہ ہے جو انڈیا یعنی بھارت کو اپنا عرف اترا بھومی یعنی Land Father سمجھتا ہے بلکہ وہ اس کو اپنا پونیہ بھومی Holy land بھی سمجھتا ہے۔ عیسائی اور مسلمان باہر سے آئی ہوئی اقوام اور اقلیتیں ہیں انہوں نے ہندوؤں پر بڑے ظلم وستم ڈھائے ہیں اور بہت سے ہندوؤں کو بزور طاقت مسلمان اور عیسائی بنایا ہے۔ مسلمانوں اور عیسائیوں کو تاریخی طور پر اس ظلم وزیادتی کو تسلیم کرنا چاہیے۔ ہندوؤں ہی کی کمزوری کی وجہ سے بیرونی طاقتیں ان پر غالب آئیں لہٰذا مستقبل میں ایسی طاقتوں سے بچاؤ کے لیے ہندو راشٹرا کا قیام نہایت ضروری ہے۔ نیز ہندو مذہب اور ثقافت کو ریفارم اور ریویو یعنی تجدیدِ نو کرنا ضروری ہے۔ گائے خالصاً ایک ہندوستانی سمبل ہے اس کی قربانی کرنے اس کی مذبح کرنے پر پابندی عائد ہونی چاہیے۔

ہندوتوا ہندوازم سے مختلف ہے، ہندوتوا ایک تاریخ کا نام ہے جو ہندوسوی لائزیشن، تاریخ، نظریہ، مذہب کا احاطہ کرتی ہے۔ ہندوتِوا ہندو نسل اور انسانیت پر مبنی خیالات کو متحرک کرنے کا نام ہے، جس سے مراد صرف ہندوپن کا اظہار ہے۔

ہندوؤں کی تاریخ سندھ کی وادیوں سے شروع ہوئی یہاں انہوں نے ایک خاص تہذیب کی بنیاد رکھی جس کے تحت انہوں نے اپنے آپ کو اپنے ایرانی بھائیوں سے کاٹ کر ایک قومیت کی بنیاد ڈالی جس کا ذکر ''رگ ویدا'' میں ''سیتا سندھوس'' کے نام سے ملتا ہے یہ ہی وہ سندھ کی وادی ہے جہاں آریںز نے اپنی قومی اور تہذیبی روایات کو شروع کیا بعد میں یہی سندھو زیادہ شہرت کے ساتھ ہندو کہلائے۔ سنسکرت کا ایس (S) بدل کر ایچ (H) میں تبدیل ہوگیا یعنی ہندو بن گیا اسی طرح سپتا، ھپتا میں بدل گیا، ہندوؤں کی جغرافیائی حدود ہمالیہ سے لے کر سیلون تک پھیلی ہوئی ہیں، جس کا سرخیل شہزادہ ایودھیا تھا۔ رام چندرا گپتا نے آریوں کو اکھٹا کر کے ان کو ایک قومی شکل میں منضبط کیا اور اس مقدس ریاست کی بنیاد ڈالی ہندوتوا والے آریاورتا، برہماورتا کی اصطلاحوں کو رد کرتے ہیں کیونکہ یہ تقسیم مقدس ریاست کو ویدک بھارت اور جین بھارت میں تقسیم کردیتی ہے۔

ہندوقوم پیدا ہوئی دریاوں کے دریا سندھ سندھو دریا نے اپنے پانی سے ہندوؤں کے اجداد کی پرورش کی اسی لیے سندھو راشٹرا ہندوؤں کی وہ مملکت قدیم ہے جس کا ذکر ان کی مذہبی کتابوں میں سندھو ساویر کے نام سے ملتا ہے۔ سندھو ساویر بھارت کا رشتہ دار تھا جس نے سندھو کی بقا کے لیے بہت سی جنگیں لڑیں اسی لیے سندھو ان کا قومی ہیرو ہے اور ان کی قدیم پہچان ہے، اسی لیے سندھو سے قدیم اقوام یعنی ایرانی، یہودی، یونانی بھی بخوبی واقف تھے اور اسی نام سے ان کو سیاسی اور جغرافیائی لحاظ سے پکارتے تھے۔ ہندوتوا والے بھی ویدک لائنز پر ہی اداروں اور ریاست کا قیام چاہتے ہیں جو کہ لبرل، سیکولر، ہیومنسٹ آدرشوں کے ساتھ اور اقدار کے ساتھ منسلک ہو لہٰذا ہندو دھرم کو اس مقصد کے لیے اس کی تجدید نو کرنا ضروری ہے تاکہ ہندوؤں کا حال ان کے ماضی کے ساتھ جڑا رہے اور وہ عزت وتوقیر اور رفعت سے اقوام عالم میں ہمکنار ہوسکیں۔

ہندوتوا والے ایک اصطلاح ملیچھستان کی استعمال کرتے ہیں۔ جس سے مراد غیر نسل اور غیر ملک کے ہوتے ہیں جبکہ سندھستان سے مراد آریاؤں کا لاجواب ملک ہے۔ نیز ملیچھستان سے مراد یہ ہے جہاں ہندوؤں کی چار قومیں نہ ہوں اور یہ سندھو دریا سے پار کا علاقہ ہے۔

پرکھارتھ، سنسکرت کی بڑی بیٹی ہے جس کو فروغ ہندی کہتے ہیں، ہندی ہندوؤں کی قومی زبان ہے۔ ہندی نئی زبان نہیں ہے۔ یہ شروع ہی سے ہندوستان میں رابطہ کی زبان رہی ہے، جبکہ سنسکرت پنڈتوں اور شہزادوں اور بادشاہوں کی زبان ہے ہندی کو آپ ہندوستانی بھی کہہ سکتے ہیں، جو تمام ہندوستان اور راج سبھا کی بھی زبان ہے اور یہ ہندوستان کی قومی زندگی کی پہچان ہے۔

مسلمانوں کے آنے ہی سے پرکھارتھ سنسکرت اور ہندو تہذیب زندگی اور موت کی کشمکش سے دوچار ہوئی جس کا سُرخیل محمد بن قاسم اور محمود غزنوی تھے، جنہوں نے ہمارے (ہندوؤں) دلوں اور روحوں کو مجروح کیا۔ کرب اور دکھ پہنچانے کی آخری کڑی ابدالی تھا۔ اسلام کی امن بخشنے والی تلوار نے نا صرف ہندوؤں کو مجروح کیا بلکہ یہ ساسانیوں اور بازنطینیوں کو کچلتی ہوئی افغانستان اور بلوچستان تک آ پہنچیں۔ دنیا کی تلوار کے زیرسایہ آ گئی، ان مسلمان فاتحین نے دنیا کی تہذیب کا حشر بگاڑ دیا...... یہ واحد ہندوستان تھا جو عرب کی آندھی کا تنِ تنہا مقابلہ بے جگری سے کرتا رہا اور انسانی تہذیب وتمدن کو بچاتا رہا اخلاقی اور فوجی لحاظ سے وہ اورنگزیب تک اس آندھی کا مقابلہ بے جگری سے کرتے رہے گو کہ وہ

معرکہ ہار گئے لیکن اخلاقی جنگ جیت گئے ان کی اخلاقی فتح اکبر اور دارا شکوہ کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ ہندوتوا کی تحریک ہندوستان، قوم اور ریاست کو انہی غیر ملکی حملہ آوروں سے بچانے کی جنگ ہے ہماری (ہندوؤں) یہ جنگ مذہبی نہیں بلکہ قومی اور سیاسی ہے۔ ہم ہندوستان کی تمام قوموں اور نسلوں کو ہندو قوم سمجھتے ہیں ہم تہذیبی یکجہتی اور شہری تمدن کے علم بردار ہیں...... اسی لیے ہم مذہبی ہئیت کو رد کرتے ہیں اور مذہب کو قومیت کی شناخت کا سرخیل نہیں سمجھتے۔ ہندوتوا ہندو قوم کا نجات دہندہ ہے، ہم ہی کشمیری پنڈتوں کو ظلم و جبر سے بچا سکتے ہیں اسی لیے ہم ہندو احساسات و جذبات ہندو ہیروز کو ہر سطح پر اجاگر کرتے ہیں۔ پرتھوی راج، سیوا جی مہاراج، راج سینا، باؤجی مہاراج، گروگو بند شینا وغیرہ کے کارناموں کو اجاگر کرتے اور ان کے کارناموں سے عوام کو روشناس کراتے ہیں۔ عرب، مسلمان ہماری قومی روایات اور مذہب کے متعلق تو بہت کچھ جانتے ہیں لیکن بحیثیت ہندو قوم کے یہ ہم سے واقف نہیں ہیں لہٰذا جو لوگ ہندوستان کو اپنا Father Land نہیں مانتے اور اس کو اپنا Holy land بھی نہیں مانتے ان کو ہندوستان چھوڑنا پڑے گا۔ اگر کسی کو ہندوستان ریاست کا شہری بننا ہے تو ہندوستان کو اپنا Father اور Holy land ماننا پڑے گا۔ اس کو ہندوستان چھوڑنا پڑے گا۔ ہمارا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ ''مادہ'' خدا نے تخلیق کیا ہے۔ انسان نے اس کو ترتیب دے کر تہذیب کی تخلیق کی ہے۔ انسان تہذیب کا خالق ہے اور خدا مادہ کا، انسان جب تہذیب کو تخلیق کرتا ہے تو اپنی روح کو خوشی بخشتا ہے وہ اس خوشی سے ''حسن'' اور ''محبت'' کو کشید کرتا ہے اور زندگی کو جلا بخشتا ہے کوئی قوم اس وقت تک تہذیب یافتہ نہیں ہو سکتی، جب تک وہ اپنے خیالات کو مجتمع کر کے اپنا دائرہ کار متعین نہیں کرتی۔ ادب، آرٹ، خیالات کو مجتمع کرنے کا نام تہذیب ہے۔ ہندو قوم نے مادہ کو تعمیر کر کے تہذیب کی بنیاد ڈالی۔

ویدکی طرف پلٹو / رجوع کرو:

ویدکی طرف پلٹو سے مراد ہندوتوا والے یہ لیتے ہیں کہ ریاست کو ان خطوط پر قائم کیا جائے اور دوبارہ استوار کیا جائے جیسا کہ تاریخی طور پر پرانی ویدوں میں اس کا تذکرہ ملتا ہے، ان کے مطابق وکرما جیت، بھاواشیائے پرنا اور پرواوغیرہ کے مطابق آریاؤں کا بہترین ملک سندھوستان ہے اسی کی بنیاد پر ہم ہندوستانی اور غیر ہندوستانی کے درمیان حدِ فاصل کھینچ سکتے ہیں جیسا کہ ان بادشاہوں نے ملیچھوں اور آریاؤں کے درمیان لکیر کھینچی تھی۔ یہ بادشاہ اس کو سندھو یعنی بھارت ورتا کے نام سے پکارتے تھے۔ ریاست کی تعمیرِ نو میں ہماری نسل کی پرانی یاداشتوں کا بڑا عمل دخل ہے۔ اس نسلی تفوق کی تفریق جہاں اس کا تعلق ہمارے انتہائی ماضی سے ہے وہیں اس کا تعلق ہمارے آنے والے مستقبل سے بھی ہے۔ یہی ہماری لافانیت اور ابدیت ہے۔ سندھو دریا سے لے کر برہما پُترا تک کا علاقہ ہماری راجنا راشٹرم ہے جس پر ہمارے قدیم راجاؤں کی حکومت رہی ہے۔ لہٰذا ہم ہندوستانی ریاست کا تعین محض اس کی جغرافیائی حدود یا زمین کے ٹکڑے پر نہیں کرتے بلکہ اس سے مراد ملیچھستان اور غیر ملیچھستان ہے۔

مندرجہ بالا صفحات میں قوم پرستی کے اجزائے ترکیبی بیان کیے ہیں۔ اس کے تحت آپ مسلم قوم پرستی کو پان نیشنلزم، مذہبی نیشنلزم، تنویری قوم پرستی، رومینٹک نیشنلزم، وغیرہ کے دائرہ کار کے اندر رکھ کر اس کا تجزیہ کر سکتے ہیں۔ برصغیر کے سیاسی اور تاریخی منظر نامہ پر مسلم قوم پرستی انہی اجزائے ترکیبی کا ایک ملغوبہ ہے۔

مسلم قوم پرستی:

ہندوستان میں مسلم قوم پرستی اور وطن پرستی کا بیج سرسید احمد خان اور ان کے رفقاء اور ان کی فکر سے متاثر محمد علی جوہر، مولانا شبلی اور مولانا مدنی، وغیرہ کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ تحریکِ خلافت کے آخری دور نے مسلم قوم پرستی اور وطن پرستی کی فکر کو اجاگر کیا۔ جمعیتِ علماء ہند کے پلیٹ فارم نے مسلم قوم پرستی / وطن پرستی کو اسلامی جامہ پہنانے میں ہراوّل دستہ کا کام کیا تاکہ مسلمانوں کا مادی اور سیاسی لحاظ سے ہندوؤں کے بالمقابل ہر سطح پر تحفظ کیا جا سکے...... علی گڑھ، سرسید احمد خان اور ان کے رفقاء کار نے مسلمانوں کا قومی تصور ابھارا۔ مسلم حقوق، مساوات، ترقی، سیکولرازم، مادہ پرستانہ سوچ کو پھیلانے کا بنیادی مقصد یہ ہی تھا کہ مسلمانوں اور ان کے زعماء کار کو ہندوؤں کے بالمقابل انگریزوں کے زیادہ قریب ان کا دوست اور ان کا بہی خواہ ثابت کیا جا سکے اور مسلمانوں کے معاشی مفادات، معاشی ترقی، برتری، مستقبل سازی، بیوروکریسی میں مسلمانوں کا حصہ ان کو دلایا جا سکے۔ ایسا اسی وقت ہو سکتا تھا کہ مسلمان فکری اور عملی طور پر خود کو انگریز کا حلیف ثابت کر سکیں اور انگریز کو یہ باور کرایا جا سکے کہ مسلمان دور جامد سے نکل کر ترقی اور جدید تمدن کے حصول کے لیے مذہب سے نکل کر اس طرف گامزن ہو رہے ہیں، لہٰذا سرسید اور ان کے رفقاء کار کی کوشش تھی کہ مسلمان نیچرل سائنس، میڈیسن اور قانون کی تعلیم کی طرف راغب ہوں اور انگریزی عمل داری میں اپنا حصہ بقدر جثہ حاصل کر سکیں اور اس کے ریاستی ڈھانچہ میں بحیثیت ایک کل پُرزے یعنی کلرک کے اس کی ریاست کو چلانے میں معاون اور مددگار ثابت ہو سکیں۔

پان نیشنلزم:

پان نیشنلزم بنیادی طور پر ثقافتی اور گروہی قوم پرستی کا ایک ملغوبہ ہوتا ہے جہاں مختلف النوع، مختلف نسل کے لوگ حصول اغراض کے لیے ایک ریاست کے گرد مجتمع ہوتے ہیں اور بسا اوقات یہ غیر نسلی گروہ ایک مخصوص قوم پرستی کا اظہار کرتے ہیں۔ علمی طور پر اس کو پان اسلام ازم کہتے ہیں۔

پان اسلام ازم:

پان اسلام ازم بنیادی طور پر اسلامک land کے حصول کی تحریک ہے جو اسپین، بغداد اور مسلم ہندوستان کی ترقی اور کامیابی کی طرف پلٹنا چاہتی ہے۔ یہ ایک گروہی نسلی تحریک ہے جو مسلم اتحاد، مسلم ترقی اور مسلمانوں کے تحفظ کی دعویدار ہے اس کا مقصد ایک عظیم تر اسلامی قومی ریاست کے قیام پر مبنی ہے۔ پان اسلام ازم ایک ایسی اسلامی ریاست کے قیام کی داعی ہے جو اقوامِ عالم میں مسلمانوں کو سُرخرو، مضبوط، آزاد اور طاقتور دیکھنا چاہتی ہے اور کلونیلزم اور کلونل ریاستوں سے مسلم ریاستوں اور مسلمانوں کو تحفظ فراہم کرنا اس کا بنیادی مطمع نگاہ ہے۔ اس کے داعی (بالخصوص جمال الدین افغانی) عبدہٗ، آزاد، مدنی وغیرہ) چاہتے ہیں کہ مسلمان اپنے آپ کو جدید دور سے ہم آہنگ کریں اور زمانے کے ساتھ قدم بقدم چل سکیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان معاشرتی اور معاشی تبدیلیاں لائیں اور دورِ جامد سے باہر آئیں تاکہ اسلامی جمعیت کو اقوامِ عالم کے بالمقابل ابھارا جا سکے، مسلمان عقل سے اپنا تعلق جوڑ کر دوبارہ مساوات، ترقی اور معاشرتی یکجہتی سے ہم آہنگ ہو سکتے ہیں۔ فی زمانہ حزب التحریر، ڈاکٹر اسرار، ڈاکٹر طاہر القادری اور ڈاکٹر علامہ اقبال کی فکر کو اسی سانچے میں رکھ کر تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ پان اسلام ازم کی کوکھ سے ہی پان عرب ازم اور پان نے سر نکالا جو بعد ازاں ہندوستان میں مسلم قوم پرستی بنا...... ہندوستان میں مسلم قوم پرستی نے 19 ویں صدی میں جڑ پکڑی، جس کی بنیاد لسانی، مذہبی تفریق اور مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ برطانوی عمل داری میں رہتے ہوئے کرنا تھا۔ مسلم قوم پرستی کے رجحان کو غالب کرنے میں علی گڑھ تحریک، تحریکِ خلافت، جمعیتِ علماء ہند، بریلوی، دیوبندی تفریق نے اہم کردار ادا کیا۔

پان اسلام ازم کا بنیادی مقصد مسلم ریاستوں کو تحفظ فراہم کرنے کی راہ نکالنا اور مسلمانوں کو حقوق دلانا تھا۔ فی زمانہ مغربی سرمایہ دارانہ ریاستیں مسلم ممالک میں پان اسلام ازم کو لبرٹی، فریڈم اور جمہوریت کے فروغ کا ذریعہ سمجھتی ہیں اور لبرل ازم کے بالمقابل پان اسلام ازم کو متوازی قوت کے طور پر متعارف کرانا چاہتی ہیں اسی لیے امریکا مسلم دنیا میں پان اسلام ازم کو بحیثیت ایک بالمقابل سیاسی قوت کے استعمال کرنے کا متمنی ہے تاکہ مسلم ممالک میں مغربی فکر اور اس کی عمل داری کو اسلامی جامہ کے اندر پیش کیا جا سکے اور مسلم ممالک میں ایک اصلاح پسند اسلام کو سامنے لایا جا سکے۔

پان عرب ازم:

پان عرب ازم کا بنیادی مقصد ترکوں کے خلاف سیاسی طاقت اور قوت کا حصول تھا۔ عرب کی زمانۂ جاہلیت کی تاریخ اور اسلامی عرب کی تاریخ اس کی فکر کا بنیادی منبع اور مرکز تھا۔ پہلی جنگِ عظیم کے آغاز میں فرانس اور انگلستان کو ایسے اتحادیوں کی تلاش تھی جو جرمنی اور عثمانی خلافت کے مدمقابل ان کے اتحادی بن سکیں۔ لہٰذا دونوں طاغوتی طاقتوں نے عرب دنیا اور مسلم افریقہ میں عرب نیشنلزم کو ہوا دینا شروع کی۔

شریفِ مکہ کو اس وقت عالمِ اسلام میں بڑی اہمیت حاصل تھی اور عرب دنیا میں اس کا بڑا اثر ورسوخ تھا۔ مغربی طاقتوں نے شریفِ مکہ کو ترکوں کی عملداری سے نکلنے کے لیے اکسایا۔ یہودیوں کے بڑھتے ہوئے عزائم نے بھی عرب دنیا کو پان عرب ازم کی طرف مائل کیا۔ دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے کے بعد عرب مفادات کے حصول کے لیے عرب لیگ کا قیام عمل میں آیا جس نے اپنے علیحدہ تشخص کو ابھارا۔ عرب نیشنلزم کے بنیادی اصول ۱۹۶۰ء میں بعث پارٹی کے بعد مرتب ہوئے۔ عرب قوم پرستی کا دوسرا بڑا چیمپئن مصر کا جمال عبدالناصر تھا جو کہ بعث تو نہ تھا لیکن اس کے خیالات بہت حد تک بعث پارٹی کا چربہ ضرور تھے۔ ناصر عرب اتحاد اور سوشلزم کا داعی تھا پان عرب ازم میں نمائشی عنصر عرب ثقافت، عرب اتحاد اور سیاسی آزادی کو اقداری حیثیت حاصل ہے۔ اس کے تحت عربی زبان، عرب اشرافیہ، عرب جغرافیہ کو اہمیت حاصل ہے۔ عرب پان ازم کے بالمقابل عرب مسلم نیشنلزم کا داعی سعودی عرب ہے، جس کو مغربی دنیا بطور اپنے اتحادی کے ایک بفر ایجنڈ کے استعمال کرتی ہے۔ ہر دو طرح عرب نیشنلزم کے فروغ میں ان عرب دانشوروں کا بہت بڑا کردار ہے جو مغرب سے مرعوب تھے اور مغربی تعلیم کے حصول کو اور تیل کی دولت کو عرب دنیا اور اس کی ریاستوں کے تحفظ کا ذریعہ سمجھتے تھے۔

پاکستانی قوم پرستی:

پاکستانی قوم پرستی نے مسلم قوم پرستی کی کوکھ سے جنم لیا جس کی بنیادی ترجیح اقوامِ عالم کے بالمقابل معاشی مفاد اور اغراض کا حصول ہے۔ اس کا دوسرا بڑا مقصد ہندوستان کے بالمقابل پاکستان کو دفاعی لحاظ سے مضبوط کرنا، نیز پاکستان کو ہندوستان کے بالمقابل ایسی قوت کے طور پر پیش کرنا ہے جو مغرب کا حقیقی حلیف ہے۔ پاکستانی قوم پرستی کا ایک اور ہدف پاکستانی وطن پرستی کو نچلی سطح پر اس طرح فروغ دینا ہے کہ اسلامی اقدار اور اسلامی شعار کو پاکستانی قوم پرستی کے فروغ کے لیے بطور ہتھیار کے استعمال کیا جاسکے۔ یہ تمام تصورات باطل ہیں کیوں کہ یہ سب اسی دنیا میں جنت بنانا چاہتے ہیں اور مغربی اقدار، آزادی، حقوق، ترقی اور مساوات کو زندگی کا حاصل قرار دیتے ہیں۔ یہ اقدار ان کو مادی ترقی، خودغرضی، قوت، مرتبے اور مقام کی تلاش پر اکساتی ہیں اور آفاقی تصورات حشر، انصاف، موت، میزان، معاد کے تصورِ اُخروی کے حصول کو دھندلا دیتی ہیں اور مسلمانوں کو ''امت وسط'' کے برخلاف سرمایہ دارانہ استعماری قوتوں کا حلیف بن جانے کے لیے اکساتی ہیں۔

پاکستانی قوم پرستی اور مسلم قوم پرستی اپنانے کا مطلب ہے کہ آپ نے سرمایہ داری کے نظریہ کو معاشرت، فرد اور ریاست کی سطح پر مساوات، ترقی، آزادی اور حقوق کے دائرہ کار کے اندر رہتے ہوئے قبول کرلیا ہے، آپ طاغوت پر قوت کے حصول کے لیے ایمان لے آئے ہیں، اسلام کے آفاقی تصور ایمان، اسلام اور احسان سے بری الذمہ ہوگئے ہیں اور آپ نے ایمانِ مفصل اور ایمانِ مجمل کی تفصیل کی جگہ قوم اور ریاست بل قوہ اور انسانیت پرستی کو لذت پروری کے لیے قبول کرلیا ہے۔

مسلم اور ہندو قوم پرستی کا تقابلی مطالعہ

1857ء کے جہاد کی شکست محض عسکری شکست نہ تھی بلکہ یہ آگے چل کر انگریز کے ایجنٹوں کے زیرِ سایہ (سرسید، امیر علی، چراغ علی وغیرہ) فرد، معاشرت اور معیشت کی شکست بھی ثابت ہوئی۔ ایمان، احسان اور اسلام کی جگہ سیکولر اور لبرل اقدار اور نظریات، آزادی، ترقی، مساوات اور حقوق نے لے لی۔ اس فکری اور عسکری شکست نے ہندو مسلم رواداری، دعوت و محبت اور فروغِ اسلام کو ناممکن بنا دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ محبت و دعوت کی جگہ بالمقابلہ تفوق، بغض، حسد کو پیدا کر کے ہندو مسلم قوم پرستی کو پھلنے پھولنے کی راہ دکھائی۔ چنانچہ مسلم قوم پرستی، وطن پرستی کے جذبات نے ملت کے مباحث کو پسِ پشت ڈال کر اسلام اور مسلمانوں کے مادی مفادات کے حصول کے ساتھ خلط ملط کردیا۔ سالمیتِ پاکستان اور بقاء مسلمان اور غلبۂ دین ایک ہی چیز تصور کیے جاتے ہیں۔ اسلامی ریاست اور قومی ریاست ایک دوسرے کے ساتھ خلط ملط اس طرح ہوئے کہ اسلام پاکستان اور پاکستان اسلام بن گیا۔ ''امت''، ''مسلمان''، ''ایمان''، ''احسان'' فراموش کردیئے گئے۔

ساخت کے لحاظ سے ہندو و مسلم قوم پرستی میں کچھ زیادہ بنیادی فرق نہیں ہے۔ دونوں کی تشکیل ایک ہی طرح کے جذبے پر رہتی ہے، یعنی حرص، حسد، مقابلہ (دشمنی، عداوت، بغض) دونوں کے ہی بنیادی اوصاف حمیدہ (رذیلہ) ایک ہی ہیں، دونوں یعنی مسلم و ہندو قوم پرستی اپنے لبرل اور سیکولر ہونے کو وجہ جواز بناتی ہیں تا کہ اپنی قوم کو جدید آفاقی (سرمایہ دارانہ) دعویٰ اور اقدار کا علم بردار قرار دے سکیں۔ رواداری، انسانیت پرستی دونوں کو ہی یہ بنیادی اقدار کے طور پر قبول کرتی ہیں۔ مذہب اور مذہبی اقدار کو قومی جذبات کے فروغ کے لیے بطور ہتھیار کے استعمال کرتی ہیں اور اقوامِ عالم میں ایک برتر تشخص، تفوق، برتری اور مقابلہ کی دعویٰ دار ہوتی ہیں۔ دونوں کا ہی بنیادی ہدف ریاست کا حصول ہوتا ہے اور دونوں ہی انسانی جذبات اور میلانات کو فروغ دینے کے لیے نفسِ امارہ کو مہمیز دینے کے لیے غیر قوم سے تصادم/نزاع/تعارض/جدل/مخالف قوم سے مسابقت/رقابت کو انسان کا فطری جذبہ قرار دیتی ہیں۔

ذیل میں ہندو مسلم قوم پرستی میں فرق اور مماثلت کو واضح کیا گیا ہے:

مسلم قوم پرست	ہندو قوم پرستی
☆...... مسلم لیگ کا دعویٰ کہ پاکستان کے اندر بسنے والی قوم صدیوں پرانی ہے۔	☆...... ہندوتوا کا دعویٰ ہے کہ ہندو ہندوستان میں قدیم قوم ہیں۔
☆...... اپنی تاریخ ہے جو موہن جوداڑو، ہڑپہ اور ٹیکسلا سے شروع ہوتی ہے۔	☆...... اپنی تاریخ ہے جو سندھو دریا سے شروع ہوتی ہے۔
☆...... بھلائی فلاح مسلم ورثہ ہے۔	☆...... فلاح، انسانیت اور فطرت کے بغیر ہندو ہے
☆...... اپنے ہیرو ہیں محمد بن قاسم، غوری اور بابر وغیرہ	☆...... اپنے ہیرو ہیں: پرتھوی راج اور سیواجی، باؤ جی وغیرہ
☆...... ترقی، مساوات، حقوق، بنیادی نعرے ہیں، حقوق العباد=حقوق انسانی ایک ہی چیز ہے۔	☆...... ترقی، مساوات، حقوق، بنیادی نعرے ہیں، حقوق انسانی کو مساوات کے دائرے میں تفوق حاصل ہے۔
☆...... نقطۂ ماسکہ: غیر قومی ریاست کو رد کرتے ہیں جمہوریت کو قبول کرتے ہیں، ترقی کو اہم ہدف قرار دیتے ہیں، معاشی مفادات کو ترجیح حاصل ہے۔ آزادی، امن آشتی کو اہمیت حاصل ہے	☆...... نقطۂ ماسکہ: غیر قومی ریاست کو رد کرتے ہیں، جمہوریت کو قبول کرتے ہیں، ترقی کو اہم ہدف قرار دیتے ہیں، معاشی مفادات کو ترجیح حاصل ہے۔ ماحول کی درستگی، امن و آشتی کا خود کو خوگر قرار دیتے ہیں۔
☆...... معاشی مفاد کو معاد پر ترجیح حاصل ہے۔	☆...... معاد کا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔ معاشی ترقی کو ہر چیز پر اولیت حاصل ہے۔

☆...... ریاست کی تعمیر اور ترقی اور قوت کا حصول جدوجہد کا حاصل ہے۔

☆...... ریاست کی ہندو بنیادوں پر تجدید اور قوت کا حصول اہم ہے۔

لبرل ازم کیا ہے؟

تاریخ:

لبرل ازم سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کو وہ نظریاتی جواز فراہم کرتا ہے جو تاریخی طور پر سب سے زیادہ کامیاب ثابت ہوا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی یورپ میں چودھویں صدی عیسوی سے رائج ہونا شروع ہوا اور اس نظامِ زندگی کی توجیہہ ان عیسائی مفکرین نے کی جو پوپ اور کیتھولک ازم (Catholicism) کے باغی تھے۔ لیکن یہ توجیہات سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کے فروغ اور استحکام کے لیے زیادہ کارآمد نہ ہوسکیں۔ سولہویں اور سترہویں صدی میں جو غیر کیتھولک ریاستیں یورپ میں قائم ہوئیں وہ مذہبی ریاستیں تھیں۔ اور انہوں نے سرمایہ دارانہ معاشرت کے فروغ کی راہ میں مختلف پابندیاں عائد کیں۔ ان مذہبی ریاستوں کے خلاف سرمایہ دارانہ حلقوں نے جو بغاوت برپا کی وہ لبرل ازم ہے۔ لبرل ازم کا بانی مفکر جان لاک (John Locke) ہے۔ میری رائے میں لبرل ازم کی پانچ صدیوں کی تاریخ میں اس سے زیادہ موٴثر مفکر پیدا نہیں ہوا۔ یہ اتنا صاحبِ اثر مفکر ہے کہ اس نے دورِ حاضر کی اسلامی فکر کو بھی بہت متاثر کیا ہے اور بیسویں صدی کے سب سے اہم اسلامی سیاسی مفکر مولانا مودودیؒ جان لاک کے کلیدی تصورات کی اسلام کاری اپنی کتابوں مثلاً ''تحریکِ اسلامی کی اخلاقی بنیادیں'' اور ''خلافت و ملوکیت'' میں کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جان لاک اس عیسائی ریاست کا باغی تھا جس کو Oliver Cromwell نے سترہویں صدی کے وسط میں برطانیہ میں قائم کیا تھا جو لگ بھگ تیس سال تک قائم رہی۔ لاک کی اہم ترین بنیادی کتاب کا نام ''The Second Tretise on Government'' ہے اور اس کتاب میں لبرل تصورِ انفرادیت، معاشرت اور ریاست کے جو تصورات پیش کیے گئے ہیں لبرل مفکرین پچھلے پانچ سو سالوں میں ان کی تشریح اور تفصیل ہی بیان کر رہے ہیں۔ ان تصورات کی فلسفیانہ توجیہہ اگلی صدی میں فرانس میں Rousseau اور جرمنی میں Emanuel Kant نے کی اور اٹھارہویں صدی میں اس فکر کی بنیاد پر امریکا اور فرانس میں کامیاب سیاسی انقلاب برپا کیے گئے۔ اٹھارہویں صدی کے یورپ میں لبرل ازم کی مربوط اور منظّم فکری مزاحمت نظر نہیں آتی اور عیسائی سیاسی تصورات لبرل مباحث میں ضم ہوتے نظر آتے ہیں۔ انیسویں صدی میں Marx اور Nietzsch لبرل ازم کے اہم فکری مخالفین کے طور پر ابھرے اور انہوں نے اشتراکیت اور قوم پرستی کو سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کے فروغ کے لیے زیادہ سازگار نظریات کے طور پر پیش کیا۔ اور اشتراکیت اور قوم پرستی کامیاب عوامی تحاریک برپا کرنے میں کامیاب ہوئیں اور جرمنی، جاپان، روس اور چین میں اشتراکیت اور قوم پرست ریاستیں قائم ہوگئیں لیکن سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کے فروغ اور استحکام کے لیے

یہ اتنی مفید ثابت نہ ہوسکیں جتنی لبرل ریاستیں اور عیسائی فکر کی طرح قوم پرستانہ اور اشتراکی فکر بھی بتدریج لبرل مباحث میں ضم ہوتی چلی گئیں۔ بیسویں صدی سے لبرل ازم کو دو دیگر سرمایہ دارانہ نظریات Post Colonialism اور Post Modernism کے چیلنج کا سامنا کرنا پڑا۔ فکری سطح پر Post Colonialism کے چیلنج کو امریکی مفکر جان رالز (Jhon Rawls) اور Thomas Nagel نے لغو (Incoherent) ثابت کیا اور Post Modernism کا حتمی نقد جرمن مفکرین ہیبر ماس (Habermas) اور Gadamor نے مرتب کیا۔ Post Modernism اور Post Colonialism ان معنوں میں ناکام تحریکیں ہیں کہ وہ سرمایہ کی مسلسل بڑھوتری کے لیے لبرل ازم سے بہتر معاشرتی اور ریاستی اداراتی صف بندی کے تصورات پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ لیکن ان معنوں میں یہ تحریکیں کامیاب ہیں کہ انہوں نے سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کے ایسے تضادات کی نشاندہی کی ہے جن کو رفع کرنے کی استطاعت لبرل نظریات نہیں رکھتے۔

لبرل نظامِ فکر ان معنوں میں یقیناً ایک بحران کا سامنا کر رہا ہے کہ اب یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ لبرل اہداف یعنی ''آزادی'' اور ''ترقی'' ناقابلِ حصول اہداف ہیں۔ لیکن یہ بات صرف منطقی اور فکری سطح پر واضح ہوئی ہے اور کوئی بھی لبرل مفکر آج یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ لامحدود ترقی اور آزادی قابلِ حصول اہداف ہیں (یہ بات سب سے واضح طور پر ان مباحث میں پائی جاتی ہے جن کی ابتدا Heidegger نے کی اور جو آج Complexity theory کہلاتی ہے) اور یہ سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کی شکست و ریخت کا ایک مظہر ہے کیوں کہ آزادی اور ترقی صرف لبرل ازم کے اہداف نہیں وہ قوم پرستی اور اشتراکیت کے بھی اہداف ہیں۔ لبرل ازم، اشتراکیت اور قوم پرستی کی لغویت کا اظہار سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کی بتدریج شکست و ریخت کا ایک مظہر ہے لیکن جیسا کہ Alain Badiou اور Slavoj Zizek واضح کرتے ہیں، ابھی یہ بات بالکل عیاں نہیں کہ سرمایہ دارانہ نظمِ حیات کا متبادل کیا ہے۔ Zizek کہتا ہے کہ ہم جس دور میں رہ رہے ہیں وہ ایک Liminal دور ہے۔ یہ واضح ہوگیا ہے کہ آزادی اور ترقی غیر معقول اور لغو اہداف ہیں لیکن انسانوں کی بہت بڑی اکثریت انہی نامعقول اور لغو اہداف پر ایمان رکھتی ہے اور رائے عامہ کو متاثر کرنے والے تمام مباحث (Policy discourse) انہی اہداف کے حصول کی حکمت عملیاں ترتیب دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کوئی بھی سرمایہ دارانہ مخالف مزاحمتی تحریک آزادی اور ترقی کے اہداف کو واضح طور پر رد نہیں کرتی بلکہ اپنی مزاحمت کو حصولِ آزادی اور ترقی کا ذریعہ گردانتی ہے۔ ان حالات میں یہ بات بالکل واضح نہیں ہے کہ سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کا متبادل کیا ہوگا، اور کتنی صدیوں تک گومگو کی یہ کیفیت جاری رہے گی۔ تحریکاتِ اسلامی میں یہ رائے عام ہے کہ آنے والا نظام اسلام ہی ہوگا لیکن لگتا تو ایسا ہے کہ امام مہدی علیہ السلام کے ظہور میں ابھی کئی ہزار سال کا وقفہ باقی ہے۔ آج تحفظِ دین اور غلبۂ دین کی جدوجہد نہایت منتشر اور غیر مربوط ہے اور سست روی کا شکار ہے۔ اسلام میں داخل ہونے والوں کی تعداد محدود ہے اور نو مسلموں کی عظیم اکثریت مسلمانوں کی عظیم اکثریت کی طرح سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کو رد کرنے کی نہ استطاعت رکھتی ہے اور نہ خواہش۔ علماء اور صوفیاء فرقہ وارانہ جھگڑوں میں بری طرح پھنسے ہوئے اور غلبۂ دین کی جدوجہد سے قطعاً لاتعلق ہیں۔ تحریکاتِ اسلامی سرمایہ دارانہ جمہوریتوں کا جزو لاینفک بنی ہوئی ہیں۔ یوں اسلامی حکومتیں قائم ہوئی ہیں لیکن ان سب (ایران، سوڈان، مصر وغیرہ) نے عالمی سرمایہ دارانہ نظام سے سمجھوتا کرلیا ہے۔ مجاہدین کی جدوجہد Mezzanine states کی سطح سے بلند ہوتی نظر نہیں آتی۔ ان ریاستوں کو عوامی پذیرائی حاصل نہیں۔ اور مجاہدینِ اسلام عوامی مقبولیت حاصل کرنے کی کوئی جدوجہد مرتب کرنے کے قائل نہیں۔ ان کا رویہ تو اس شعر سے عیاں ہے:

راہِ خدا کے متوالے ہیں اس سے بالکل بے پروا ہیں
کون ہے راضی کون خفا ہے، زنداں زنداں مقتل مقتل

اس طرح جہاد جاری تو صدیوں تک رہ سکتا ہے لیکن اس جہاد کے ذریعے توسیع پذیر نظام قائم نہیں کیا جاسکتا۔ ان حالات میں یہ توقع رکھنا کہ مستقبلِ قریب میں ہم کو عالمی نظاماتی غلبہ حاصل ہوگا خوش فہمی کے علاوہ کچھ نہیں۔ یہ یقیناً ممکن ہے کہ اسلام سرمایہ دارانہ نظام کے عالمی متبادل کے طور پر اُبھرے لیکن یہ ہرگز ناگزیر نہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف ہمیں ایک طویل مدت جدوجہد مرتب اور نافذ کرنا پڑے گی۔

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

اس جدوجہد کی ابتداء سرمایہ دارانہ نظریات سے اچھی طرح واقفیت پر منحصر ہے۔ ذیل میں لبرل تصورات کی تشریح کرنے کی کوشش کروں گا۔

لبرل تصورِ فرد:

اشتراکیت اور قوم پرستی کی طرح لبرل ازم کا بنیادی عقیدہ بھی لا الٰہ الا الانسان ہے۔ لبرل ازم کا الٰہ ہر وہ فرد ہے جو اس کلمۂ خبیثہ پر ایمان لے آئے۔ لبرل نظریہ کے تحت جو فرد اس کلمۂ خبیثہ پر ایمان نہ لائے وہ انسان نہیں۔ امریکی براعظم پر قبضہ کرنے کے دوران تقریباً آٹھ کروڑ سرخ ہندیوں (جو ایک روایت کے مطابق حضرت یونس علیہ السلام کے امتی تھے) کو قتل کیا گیا اور ان کے املاک ان سے چھین لیے گئے۔ Locke نے اس قتلِ عام اور لوٹ مار کو اس بنیاد پر جائز قرار دیا ہے کہ سرخ ہندی انسان نہیں تھے۔ ان کو اپنے انسان ہونے کا شعور نہ تھا۔ وہ قدرتی وسائل پر محنت کرکے سرمایہ کو مستقل لامتناہی بڑھوتری کے لیے استعمال نہ کرتے تھے لہٰذا ان کو قتل کرنا جائز بھی اور ضروری بھی تھا کیوں کہ وہ آوارہ بھینسوں سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھے جن کو ختم کیے بغیر امریکی دولت کو فروغ دینا ناممکن تھا۔

بیسویں صدی کے اہم ترین لبرل سیاسی مفکر جان رالز کی بھی یہی رائے ہے وہ اپنی مشہور کتاب Political Libralism میں لکھتا ہے جو افراد آزادی کو قدرِ مطلق کے طور پر قبول نہیں کرتے ان کو ختم کرنا ایسا ہی فرض ہے جیسا ایک متعدی وبا کا ختم کرنا۔ آزادی کے منکروں کو جواب دلیل سے نہیں گولی سے دیا جانا چاہیے۔

امریکی صدور بش اور اوباما نے گوانتاناموبے اور ابوغریب میں جاری ٹارچر کو اسی دلیل کی بنیاد پر جواز فراہم کیا ہے۔ اوباما کی نظر میں مجاہدینِ اسلام انسان نہیں کیوں کہ وہ آزادی پر نہیں بلکہ بندگیٔ رب پر ایمان لائے ہیں۔ مجاہدینِ اسلام کی کھال کھینچنا، ان کو زندہ جلا دینا، ان کے معصوم بچوں کو قتل کرنا، ان کی عورتوں کی عصمت دری کرنا، ان کے گھروں کو مسمار کرنا اوباما اپنا فرض سمجھتا ہے۔

لبرل ازم مجاہدینِ اسلام کے خلاف وحشت ناک درندگی کو فرض گردانتا ہے۔ وہ مسلمانوں کو آزادی پر دلیل کے ذریعے نہیں گولی اور ٹارچر کے ذریعے ایمان لانے پر مجبور کرتا ہے۔ لبرل ازم وحشت ناک درندگی کو جواز فراہم کرنے والا نظریہ اپنی پوری تاریخ میں رہا ہے۔

وہ آزادی کیا ہے جس پر لبرل ازم ہم کو ایمان لانے پر مجبور کرتا ہے؟ اس سوال کا سب سے واضح جواب Emanuel Kant نے اپنی Critiques میں دیا ہے۔ کانٹ کا بنیادی دعویٰ ہے کہ انسان قادرِ مطلق ہے۔ ہر فرد کے ذہن میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ ان اطلاعات کو جو اس کے حواسِ خمسہ اس کو فراہم کرتے ہیں اس طرح سے مرتب کرے کہ وہ مربوط تصورات (Concepts) میں ڈھل جائیں۔ ان تصورات کی تعمیر اور ترتیب کے ذریعے انسان تسخیرِ کائنات کا مکلّف ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی تمام خواہشات کے حصول کے لیے ایسا ذریعہ اختیار کرنے کے قابل ہو جاتا ہے جو کسی دوسرے انسان کو اپنی خواہشات کے حصول کی راہ میں مزاحم نہیں ہوتا۔ اشیاء اور اعمال کی قدر اس بنیاد پر متعین ہوتی ہے کہ وہ عمل ہر انسان کو اپنی خواہشات کی تکمیل ممکن بنانے میں کتنا معاون ہے۔

کانٹ کے تصورات کے مطابق خرد نفس کی غلام بھی ہے اور معلم بھی۔ وہ نفس کی غلام ان معنوں میں ہے کہ وہ نفس کے احکام کی تعمیل کو رد نہیں کر سکتی اور معلم ان معنوں میں کہ خرد اس عمل کی نشاندہی کرتی ہے جس کے ذریعے نفس کے حکم کی تعمیل اس طرح ہو کہ کسی دوسرے انسان کے نفس کے حکم کی تکمیل میں مزاحمت نہ ہو۔ مثال کے طور پر اوباما زنا کرنا چاہتا ہے خرد اوباما کو بتائے گی کہ وہ زنا اس طرح کرے کہ ہیلری کلنٹن کی خواہشِ نفس کی تکمیل بھی ممکن ہو سکے۔ اگر ہیلری کلنٹن اوباما سے زنا کرنے راضی ہے تو اوباما ہیلری کلنٹن کے ساتھ زنا کرے اگر ہیلری کلنٹن اوباما کے ساتھ زنا کرنے سے راضی نہیں تو اوباما ہیلری کلنٹن کا احترام کرے اور زنا کسی دوسری عورت یا مرد کے ساتھ کرے جو اوباما کے ساتھ زنا کرنے کو تیار ہو۔

Kant کے مطابق خرد (Reason) اوباما کو یہ سبق دیتی ہے کہ کسی عمل کو (مثلاً زنا) کی کوئی مطلق قدر نہیں، قدر صرف طریقہ (Procedure) کی ہے اور یہ قدر صرف اس بات سے متعین ہوتی ہے کہ وہ طرائق بڑھوتریٔ آزادی یعنی بڑھوتریٔ سرمایہ میں کتنی معاون ہیں۔ ہر وہ عمل بے قدر ہے جو بڑھوتریٔ سرمایہ (یعنی بڑھوتریٔ آزادی) کو فروغ نہیں دیتا۔ ظاہر ہے کہ قدر کے تعین کا یہ نظام صرف اسی دائرے میں نافذ العمل ہے جہاں ہر فرد بڑھوتریٔ آزادی (یعنی بڑھوتریٔ سرمایہ) پر ایمان رکھتا ہو، لہٰذا دائرہ میں اگر ایسے افراد موجود ہیں جو بڑھوتریٔ سرمایہ (یعنی بڑھوتریٔ آزادی) کو قدر مطلق کے طور پر قبول نہیں کرتے تو اوباما کا فرض ہے کہ ایسے افراد کو فی الفور قتل کر دے۔ ایسے افراد کو دلیل دینے سے کچھ حاصل نہ ہوگا کیوں کہ بڑھوتریٔ آزادی (یعنی بڑھوتریٔ سرمایہ) کو قدرِ مطلق کے طور پر قبول کرنے پر لوگوں کو مجبور ہی کیا جا سکتا ہے قائل نہیں کیا جا سکتا۔

جو لوگ بڑھوتریٔ آزادی (یعنی الوہیتِ انسان) پر ایمان لے آئے ان کو کانٹ Humanbeing کہتا ہے۔ بیسویں صدی میں پہلی مرتبہ بڑی تعداد میں انسان Human being بن گئے۔ بقول Foucalt سترہویں صدی سے قبل Human being کا وجود سرے سے ناپید تھا۔ لاک Lock کے مطابق ہر Human being کے تین بنیادی ہیومن رائٹس ہوتے ہیں۔ یہ ہیومن رائٹس صرف ان افراد کے ہوتے ہیں جو الوہیتِ انسان پر ایمان لے آئے ہوں۔ ریڈ انڈین اور مجاہدینِ اسلام کے کوئی ہیومن رائٹس تسلیم نہیں کیے جا سکتے کیوں کہ وہ الوہیتِ انسان پر ایمان نہیں لائے۔ وہ Human being نہیں ہیں۔

اقوام متحدہ کے منشور کے تحت بنیادی ہیومن رائٹس تین ہیں:

۱......حقِ تحفظ زندگی:

ہر فرد کا یہ فرض / حق ہے کہ وہ اپنی زندگی بڑھوتریٔ آزادی بڑھوتریٔ سرمایہ کے عمل میں جس طرح کھپانا چاہیے کھپائے۔ جب تک وہ زندگی اس فرض کی ادائیگی میں کھپائے رکھے گا اس کی زندگی محفوظ رہے گی۔ اگر اس نے اپنی جان بڑھوتریٔ آزادی (بڑھوتریٔ سرمایہ) کے عمل میں مزاحمت ڈالنے کے لیے لگائی تو اوباما کا فرض ہے کہ اس کو قتل کر دے۔ جیسے مجاہدینِ اسلام کو قتل کر رہا ہے اور جیسا اوباما کے باپ دادا‌ؤں نے آٹھ کروڑ ریڈ انڈین (سرخ ہندیوں) کو قتل کیا تھا۔

۲......حقِ ملکیت:

ہر فرد کا فرض / حق ہے کہ وہ اپنی محنت اور اپنا مال سرمایہ کی بڑھوتری کے عمل میں جس طرح چاہے لگائے رکھے، اگر اس نے اپنی محنت اور اپنا مال سرمایہ کی بڑھوتری میں رخنہ ڈالنے کے لیے استعمال کیا تو اوباما اس کا مال چھین لے گا جیسا کہ وہ افغانستان میں قبضہ جمائے ہوئے ہے اور جیسا کہ اوباما کے باپ داداؤں نے سرخ ہندیوں کا تمام مال و اسباب چھین لیا تھا۔

۳......حقِ آزادیٔ رائے:

ہر شخص کا فرض / حق ہے کہ وہ بڑھوتریٔ آزادی / بڑھوتریٔ سرمایہ کے فروغ کے لیے جو رائے دینا چاہے دے، مثلاً عریاں تصاویر کی اشاعت کا حق۔ انبیاء علیہم السلام کو گالیاں دینے کا حق / فرض وغیرہ۔ چوں کہ لبرل معاشروں میں ذرائع ابلاغ پر سرمایہ کی اجارہ داری مسلط ہو جاتی ہے لہٰذا سرمایہ آزادی مخالف آراء کی تشہیر تقریباً معدوم ہو جاتی ہے اور اگر ایسی آراء سامنے آئیں تو اوباما اس کو ضبط کر لیتا ہے اور اپنے حلیف اداروں کے ذریعے ان ناقدینِ سرمایہ کاری اور لبرل اقدار کی زندگی حرام کر دیتا ہے۔

لبرل ازم جس انفرادیت کو فروغ دیتی ہے وہ شہوت اور غضب سے مغلوب انفرادیت ہے جیسا کہ اٹھارہویں صدی کے ایک عیسائی راہب St.IglesiasIII نے کیا۔ Human being انسانیت نہیں شیطنت کا مظہر ہے۔ اوباما شیطانِ کامل ہے۔

لبرل معاشرت:

لبرل ازم فرد (Human being) کو قائم بالذات (Autonomous) تصور کرتا ہے۔ ہر Human being اپنا معیارِ

خیر و شر اور اپنا نظامِ زندگی خود متعین کرنے کا مکلّف تصور کیا جاتا ہے۔ ہر فرد اپنے نفس کے احکامات (خواہشاتِ نفسانیہ) کی تسکین کے لیے اپنی خرد کے ذریعہ ایسا نظام العمل (Life plan) مرتب کرتا ہے جو ہر دوسرے Human being کے اس مادی حق (Equal right) کو تسلیم کرتا ہے کہ یہ دوسرا Human being بھی اپنی خواہشاتِ نفسانیہ کی تکمیل بغیر کسی رکاوٹ کے کر سکے۔

Rousseau کہتا ہے کہ معاشرہ کی بنیاد ایک ایسے Social Contract (معاشرتی معاہدہ) پر رکھی جاتی ہے، جس میں ہر Human being اپنی انفرادی آزادی کے تحفظ کے لیے اس آزادی پر ایسی حدود تسلیم کرتا ہے جو معاشرہ میں شامل تمام افراد کی آزادی کے تحفظ کے لیے ضروری ہوتی ہیں اس بنیاد پر ایک لبرل ریاست۔ دستوری جمہوریہ (Constitutional republic) قائم ہوتی ہے جس کا تذکرہ ہم اگلے سیکشن میں کریں گے۔

معاشرتی سطح پر Social Contract کی بنیاد پر جو ادارتی صف بندی عمل میں آتی ہے اس کو مارکیٹ (Market) کہتے ہیں مارکیٹ بازار کی ظالمانہ تنظیم ہے۔ مارکیٹ میں ہر بیوپاری صرف اپنے سرمایہ کی بڑھوتری کے لیے داخل ہوتا ہے۔ بازار اور مارکیٹ میں جو بنیادی فرق ہے وہ میں دو مثالوں کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کروں گا:

بازار میں لین دین کا فارمولا ہے

CA -M-CB

جہاں C سے مراد ہے شے

M سے مراد ہے زر

بازار میں بیوپاری ایک شے مثلاً کپڑا (CA) لے کے آتا ہے اور اس کو زر (M) کے عوض فروخت کرتا ہے۔ اس زر سے وہ آٹا (CB) خریدتا ہے تاکہ اپنے بال بچوں کو پال سکے انفاق کر سکے وغیرہ۔ بازار میں آنے کا مقصد اپنی ضروریات کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ اس ہی کاروبار کو عبادت کا درجہ حاصل ہے اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

’’سچائی اور ایمانداری کے ساتھ کاروبار کرنے والا آخرت میں انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا‘‘ (ترمذی ابن ماجہ)

مارکیٹ میں لین دین کا فارمولہ

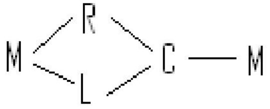

مارکیٹ میں بیوپاری زر (M) لے کر آتا ہے وہ اس زر سے خام مال (R) اور مزدوری (L) خریدتا ہے اور اس مزدوری اور خام مال کے ذریعے ایک شے (C) بنا کر بیچتا ہے تاکہ مزید زر (M1) کما سکے۔ M اور M1 میں جو فرق ہے وہ CA اور CB فرق سے بالکل مختلف ہے۔ CA اور CB میں نوعی Substantive فرق ہے۔ CA کپڑا اور CB آٹا ہے۔ M اور M1 میں کوئی نوعی فرق نہیں دونوں زر ہیں M اور M1 میں فرق صرف عددی (Quantitative) ہے۔ مارکیٹ کا بیوپاری کوشش کرتا ہے کہ M اور M1 کا فرق (M1- M) زیادہ سے زیادہ ہو۔ یہ اس کے کاروبار کرنے کا مقصد ہے۔ اس کے کاروبار کرنے کا مقصد ضروریات پورا کرنا صرف ضمنی طور پر ہوتا ہے اور اصل مقصد (M1- M) کی زیادہ سے زیادہ بڑھوتری ہے۔

M اور M1 کا فرق بیوپاری کا منافع ہوتا ہے لیکن اگر یہ منافع اصولاً مزید منافع کمانے کے لیے استعمال ہو اور اس کے باقی تمام استعمال ضمنی ہو جائیں تو یہ منافع سرمایہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ سرمایہ (Capital) وہ زر ہے جو محض اپنی مقداری بڑھوتری ’’Quantitative Accumulation‘‘ کی تلاش میں پیداواری عمل سے گزرتا رہتا ہے۔ یہ بڑھوتری لامحدود ہوتی ہے کیوں کہ سرمایہ حرص اور حسد کی تجسیم کے علاوہ کچھ نہیں اور حرص اور حسد لامحدود شیطانی قوتیں ہیں۔ سرمایہ کی بڑھوتری کو لامحدود بنانے کے لیے دو مارکیٹ قائم کیے جاتے ہیں۔ زر کی مارکیٹ (Money Market) اور سٹہ کی مارکیٹ (Capitial market) زر کی مارکیٹ میں جس قیمت پر زر بیچا اور خریدا جاتا ہے وہ سود ہے۔ اور سٹہ کے بازار میں جس قیمت میں حصص (Shares) اور تمسکات (Bonds) بیچے اور خریدے جاتے ہیں وہ مسلسل سٹہ کے کھیل کے ذریعہ متعین ہوتی ہے۔ سود کی مارکیٹ اور سٹہ کی مارکیٹ کے ذریعہ سرمایہ معاشرہ کی تمام دولت پر قبضہ کر لیتا ہے۔ زر کی مارکیٹ کے بنیادی ادارے بینک ہیں۔ یہ زر کی تشکیل کرتے ہیں (اور سرمایہ دارانہ نظام میں زر کی کوئی اصل قدر Real Value نہیں ہوتی) اور تمام افراد بینکوں میں اپنی بچتوں کو رکھنے پر مجبور کر دیے جاتے ہیں۔ بینک یہ تمام دولت سرمایہ داراوں کو قرض کے طور پر دے کر ہر شخص کی بچت کو سرمایہ کے گردشی چکر میں شامل کر دیتے ہیں۔

سٹہ کا بازار ذاتی ملکیت کو ختم کر کے سرمایہ کی ملکیت بتدریج معاشرہ پر مسلط کر دیتا ہے۔ سٹہ کی مارکیٹ کا بنیادی ادارہ کارپوریشن (Corporation) ہے یہ کارپوریشن وہ شخصِ قانونی (Legal Person) ہے جس کا مقصدِ وجود اصولاً صرف اپنے سرمایہ کی مستقل بڑھوتری ہوتا ہے۔ کارپوریشن کے مالک افراد نہیں ہوتے بلکہ سرمایہ خود اس کا مالک ہوتا ہے۔ کارپوریشن کی ملکیت لاکھوں افراد کو

سٹہ کے بازار کے ذریعہ فروخت کردی جاتی ہے۔ اوران میں کسی کو بھی عملاً یہ اختیار نہیں ہوتا کہ وہ کارپوریشن کے کاروباری عمل کے تعین میں حصہ لے۔ کارپوریشن پر ایک (Professional management) قابض ہوتی ہے اور یہ منجمنٹ اس بات پر مجبور ہوتی ہے کہ کارپوریشن کے تمام کاروباری فیصلے صرف اس بنیاد پر کیے جائیں کہ ان فیصلوں کے نفاذ کے نتیجے میں کارپوریشن کے سرمایہ کی بڑھوتری تیز سے تیز تر ہورہی ہے یا نہیں؟ اگر فیصلے کسی اور بنیاد پر کیے جائیں اور کارپوریشن کے سرمایہ کی بڑھوتری کی رفتار دوسری کمپنیوں کے مقابلے میں کم ہوجائے تو سٹہ کا مارکیٹ اس کمپنی کو سزا دیتا ہے۔ اس کے حصص کی قدر گر جاتی ہے اور آخر کار کمپنی دیوالیہ (Bankrupt) ہوجاتی ہے۔ اوراس کی منجمنٹ نکال دی جاتی ہے اور وہ کسی دوسری کارپوریشن میں ضم کرلی جاتی ہے۔ سود کی مارکیٹ اور سٹہ کی مارکیٹ سرمایہ دارانہ معاشرے میں قدر کے تعین کے ذمہ دار ادارے ہوتے ہیں۔ ہر معاشی عمل کا تعین اس بنیاد پر کیا جاتا ہے کہ اس عمل کے نتیجے میں سرمایہ کی بڑھوتری کی رفتار کتنی بڑھی ہے یا کتنی بڑھنے کی توقع ہے۔ مثلاً کارپوریشن X جانماز بناتی ہے اور کارپوریشن Y فحش فلمیں بناتی ہے تو سٹہ کی مارکیٹ ان کارپوریشنوں کے حصص کا تعین کرے گی تو اس بنیاد پر نہیں کرے گی کہ جانمازیں اور فحش فلمیں حصولِ رضائے الٰہی کا ذریعہ ہیں یا نہیں یا وہ مفادِ عام کو فروغ دیتی ہیں یا نہیں؟ حصص کی قیمتوں کا تعین کہ کس کارپوریشن کا موجود اور متوقع منافع زیادہ ہے اگر فحش فلمیں بنانے والی کارپوریشن کا حاضر اور متوقع منافع جانمازیں بنانے والی کارپویشن کے منافع سے زیادہ ہے تو فحش فلمیں بنانے والی کارپوریشن کے حصص کی قیمت بڑھے گی۔ اور چوں کہ اس فحش فلمیں بنانے والی کارپوریشن کا Divident payout اور Capital Gain زیادہ ہوگا لہٰذا تمام Fund Managers لوگوں کا سرمایہ جانماز بنانے والی کارپوریشن سے نکال کر فحش فلمیں بنانے والی کارپوریشن میں لگادیں گے۔

سرمایہ دارانہ لبرل معاشرے میں حاکمیت صرف سرمایہ کی ہوتی ہے۔ نجی ملکیت بتدریج ختم ہوتی چلی جاتی ہے۔ ہر شخص کتنا بھی امیر کیوں نہ ہو سرمایہ کا ملازم اور اس کا غلام بن جاتا ہے کیوں کہ وہ اپنی دولت بینکوں اور سٹہ کی مارکیٹ کے سپُرد کردیتا ہے۔ اور یہ بازار اس کو ایک منٹ میں مفلس بنا سکتے ہیں۔ وہ ان مارکیٹوں کے احکام کی حکم عدولی کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔

عیسیٰ پیر نہ موسیٰ پیر
سب سے بڑا سرمایہ پیر

لبرل سرمایہ دارانہ نظام میں سرمایہ پورے معاشرے پر قبضہ کرلیتا ہے۔ ہر معاشرتی ادارہ مارکیٹ میں ضم ہوجاتا ہے۔ سب سے تباہ کن اثر خاندان پر پڑتا ہے جہاں ماں باپ اولاد کی تربیت زیادہ سے زیادہ سرمایہ کمانے کے قابل بنانے کے لیے کرتے ہیں اوراس تربیت کے نتیجے میں خودغرضی، لالچ، حرص اور حسد کا سیلاب پورے معاشرے کو ڈبو دیتا ہے۔ عورتیں گھروں سے نکل کر بازاروں میں بیٹھ جاتی ہیں۔ عصمت اور عفت کی دھجیاں اُڑ جاتی ہیں۔ زنا اتنا عام ہوجاتا ہے کہ نکاح ایک نامعقول فعل نظر آنے لگتا ہے۔ حرامی بچوں کی تعداد جائز اولاد سے بڑھ جاتی ہے۔ جیسا کہ امریکا، سویڈن اور فرانس میں ہوچکا ہے جہاں حالیہ سرویز کے مطابق نصف سے زائد پیدا ہونے والے بچے حرامی ہوتے ہیں۔ اور یہ کوئی مغرب تک محدود رجحان نہیں دو ہزار گیارہ کی مردم شماری کے اعداد و شمار کے مطابق بھارت میں حرامی بچوں کی تعداد دو ہزار ایک کے مقابلے میں ۳۶۷ فی صد زیادہ تھی۔

لبرل معاشرے غلیظ ترین گھناؤنے معاشرے ہوتے ہیں دنیا میں کسی ایک ایسے ملک کی مثال نہیں دی جاسکتی جس میں لبرل معاشرت پھیلی ہو اور وہاں زنا کاری اغلام بازی اور جانوروں سے مباشرت وبا کی طرح نہ پھیلے ہوں۔ آج کل امریکا میں صلیب (Cross) کے ذریعے زنا کرنے کا شغل نہایت تیزی سے پھیل رہا ہے اور اس عمل سے روحانی فیض حاصل کرنے کے دعوے کیے جارہے ہیں۔ ان معاشروں میں مذہب کھیل تفریح اور لذت کے حصول کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ Meditation کی محفلوں میں شرکت چرس پینے کے متبادل کی حیثیت اختیار کرلیتی ہے۔ ہر شخص کو تعلیم دی جاتی ہے کہ وہ نفسانی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے بالکل آزاد ہے اور معاشرتی تنظیم کا مقصد ہی فروغِ لذاتِ خواہش اور خودغرضی ہوکر رہ جاتا ہے۔

بے کاری و عریانیوں و مے خوری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کی فتوحات

لبرل ریاست:

لبرل نظریہ مارکیٹ کی ریاست پر بالادستی پر یقین رکھتا ہے۔ اور لبرل سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی میں مارکیٹ ریاست پر غالب ہوتی ہے۔ اس کے برعکس قوم پرست اور اشترا کی سرمایہ دارانہ نظام ہائے زندگی میں مارکیٹ کے عمل پر ریاستی تحدید مختلف حد تک روا رکھی جاتی اور چوں کہ ان نظاموں میں ریاست سرمایہ کی عمومی نمائندہ (Representative of capital in general) ہونے کا دعویٰ کرتی ہے لہٰذا عموماً (اور مختلف حد تک) قوم پرست اور اشترا کی سرمایہ دارانہ ریاستیں قدر کے تعین کے عمل سے لاتعلق نہیں رہتیں اور منصوبہ بندی (Planning) کے ذریعے مارکیٹ پر اپنی بالادستی قائم کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔

لبرل ریاست ایک نمائندہ دستوریت (Constitutional Republic) ہوتی ہے جو عموماً جمہوریہ بھی ہوتی ہے۔ اس کی بنیاد بھی Rousseau کا متصور وہی سوشل کنٹریکٹ (Social Contract) فراہم کرتا ہے جس کی بنیاد پر سرمایہ دارانہ مارکیٹ قائم کی جاتی ہے۔ Repbublic سے مراد ہے عوام کی حکومت۔ عوام حکومت ان معنوں میں کرتے ہیں کہ وہ اصولاً مطلق العنان حاکم (Absolute sovereign) تصور کیے جاتے ہیں۔ وہ حکومت اسی مطلق العنان حاکمیت یعنی آزادی کو تحفظ اور فروغ دینے کے لیے کرتے ہیں۔ ہر ری پبلک کا بنیادی عقیدہ لا الٰہ الا الانسان ہی ہوتا ہے اور دستور اس عقیدہ کو ہیومن رائٹس (Human Rights) کی شکل میں اپنے مقدمہ Preamble میں شامل کرلیتا ہے۔ یہ ہیومن رائٹس ان معنوں میں مقدس ہوتے ہیں کہ عوام کو یہ حق نہیں کہ کثرت رائے سے ان ہیومن رائٹس کو منسوخ کردیں۔ چوں کہ ہیومن رائٹس الوہیت انسانی کا دعویٰ ہیں لہٰذا ہر ری پبلک میں دستور کتابِ الٰہی کی

جگہ لے لیتا ہے۔

لبرل ریاست عموماً نمائندگی (Representative) کی بنیاد پر تشکیل دی جاتی ہے۔ لبرل ریاست میں عوام خود حکومت نہیں کرتے بلکہ وہ کثرت رائے سے اپنے نمائندہ منتخب کرتے ہیں جو قانون ساز (Legislators) ہوتے ہیں۔ قانون سازی (Legislation) لازماً دستور کے تناظر میں ہی کی جاتی ہے۔ لہٰذا کوئی ایسا قانون نہیں بنایا جاسکتا جو ہیومن بینگ (Human Being) کی مطلق العنان حاکمیت اوراس کی الوہیت کی نفی کرتا ہو۔ قانون نافذ قانون ساز نہیں کرتے بلکہ یہ ایک غیر منتخب ریاستی انتظامیہ (پولیس، فوج اور سرکاری نوکرشاہی، عدلیہ) کرتی ہے۔ سب حکومت کرتے ہیں (عملاً مقننہ یعنی قانون سازان میں سب سے غیر اہم عنصر ہوتے ہیں۔) دورِ حاضر میں میڈیا بڑی کارپوریشنیں اور سرمایہ دارانہ مفکر (Capitalist Intelectuals) بھی لبرل حکومتوں کا اہم جز ہوتے ہیں ان کو عموماً یونیورسٹیوں اور Think Tanks میں منظم کیا جاتا ہے۔

قانون سازوں کے علاوہ باقی تمام گروہ غیر منتخب اور مستقل وجود رکھنے والے ہوتے ہیں اور سیاسی فیصلوں کی اصل ذمہ داری انہی مستقل حکمرانوں کی ہوتی ہے کیوں کہ یہ سرمایہ دارانہ عقلیت کے محافظ ہوتے ہیں اور ان کا فرض ہے کہ قانون سازی کا عمل سرمایہ دارانہ عقلیت سے متصادم نہ ہو۔ اصل قوت انہی مستقل حکمرانوں کے پاس ہوتی ہے اور یہ قانون سازوں کے فیصلوں کی وہ عملی تشریح کرتے ہیں جو فروغِ سرمایہ (یعنی فروغِ آزادی) کو مستقل مہمیز دے۔

گو کہ عوام گاہ گاہ مقننہ کو منتخب کرتی رہتی ہے لیکن عملاً اس کا حکومتی عمل سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اصل حکومت سرمایہ کی ہوتی ہے۔ کسی فرد یا گروہ یا ادارہ کی نہیں ہوتی۔ پورا ریاستی نظام ان اصولوں کی بنیاد پر چلایا جاتا ہے کہ سرمایہ کی بڑھوتری کی رفتار تیز سے تیز تر ہو سرمایہ ہی آزادی کی تجسیم (Concrete Form) ہے، آزادی کی کوئی دوسری تجسیم تاریخ انسانی میں پائی نہیں جاتی، مارکیٹ کی ریاست میں بھی ہر فرد سرمایہ کا غلام ہوتا ہے۔ لبرل ریاست سرمایہ کی مطلق العنان حاکمیت قائم کرتی ہے اور اس کا سٹیزن (Citizen) صرف ان معنوں میں مطلق العنان حکمران ہے کہ وہ لا الٰہ الا الانسان کے خبیث کلمہ پر ایمان لے آیا ہے اور اس نے سرمایہ دارانہ عقلیت قبول کرلی ہے۔ وہ ہر چار پانچ سال بعد اپنے ان کافرانہ عقائد اور عقلیت کا اظہار انتخاب میں حصہ لے کر کرتا ہے اور ان لوگوں کے حکومت کرنے کی تصدیق کرتا ہے (خواہ وہ منتخب مقننہ میں ہوں یا غیر منتخب فوج، پولیس، نوکرشاہی، عدلیہ، میڈیا یا یونیورسٹیوں اور Think Tanks میں) جو اس کی آزادی یعنی سرمایہ کی بڑھوتری کی عمومی رفتار کی مستقل نگرانی کررہے ہوتے ہیں۔ وہ اگر اس فرض کو انجام دینے میں ناکام ہوجائیں تو ان کو اس ہی طرح برطرف کرنے کی گنجائش موجود رہتی ہے جیسے کارپوریشن کے مینیجمنٹ کو برطرف کیا جاتا ہے۔

مارکیٹ اور ریاست میں سرمایہ دارانہ نظام ایک عام آدمی کو مجبور اور بے بس کردیتا ہے۔ مارکیٹ کے تجزیہ میں ہم نے دیکھا کہ جیسے جیسے سود کا مارکیٹ اور سٹہ کا مارکیٹ دولت پر قبضہ مستحکم کرلیتا ہے ویسے ویسے نجی ملکیت ختم ہوتی چلی جاتی ہے اور ایک عام آدمی اس بات پر مجبور ہوجاتا ہے کہ وہ سرمایہ کی غلامی (اس کو Wage labour کہتے ہیں) اختیار کرلے۔ اسی طرح ایک لبرل ریاست میں تمام قوت سرمایہ کے نمائندوں (فوج، پولیس، نوکرشاہی، عدلیہ، مقننہ، میڈیا اور Intellectulas) ہاتھوں میں مرتکز ہوجاتی ہے۔ غیر سرمایہ دارانہ اجتماع قوت مشکل سے مشکل تر ہوتا جاتا ہے اس بات کو دورِ حاضر کے فرانسیسی فلسفی Alain Badiou نے اچھی طرح بیان کیا ہے وہ کہتا ہے کہ ''جمہوریت وہ زنجیر ہے جس سے عوام کو سرمایہ کے اصطبل میں مقید کیا جاتا ہے۔''

لبرل جمہوری ریاستوں کے خلاف کامیاب سیاسی بغاوت کی تاریخ میں صرف ایک مثال ملتی ہے اور وہ ہے حزب اللہ جنوبی لبنان کی بغاوت، حزب اللہ نے جنوبی لبنان سے لبرل جمہوری نظام کو فیصلہ کن شکست دی ہے۔ اس کے علاوہ دنیا میں کبھی اور کہیں لبرل جمہوری ریاست کے خلاف کامیاب بغاوت پچھلی تین سو سالہ تاریخ میں برپا نہیں کی گئی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ لبرل جمہوری ترتیبِ اقتدار سرمایہ کی سب سے طاقت ور، جابر، ظالم اور مستحکم ریاستی نظم ہے۔ اس استحکام اور قوت کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اٹھارہویں صدی کے بعد پہلے یورپ اور پھر دنیا بھر میں مذہبی، سیاسی آدرشیں اجنبی سے اجنبی ہوتی چلی گئیں۔ انفرادی طور پر تو بہت کم لوگ لبرل مابعد الطبیعاتی تصورات پر ایمان لائے (ماسوائے یورپ) زیادہ تر لوگ مذہبی تشخص اختیار کیے رہے۔ مادیت کا معاشرے پر غلبہ بھی سست رفتار اور نامکمل ہے، مثلاً پاکستان میں پچانوے فیصد کاروبار سود اور سٹہ کے بازاروں کی دسترس سے باہر ہے اور دس فی صد سے کم پاکستانی بینکوں میں اکاؤنٹ رکھتے ہیں۔

لیکن ان صدیوں کی لبرل معقولیت اس وسیع پیمانے پر تسلیم کی گئی کہ مذہبی تشخص رکھنے والے عوام اور خواص کی عظیم اکثریت اس بات کی قائل ہوگئی کہ جائز (legitimate) اور معقول صف بندی وہی ہے جو لبرل نظامِ اقتدار تجویز کرتا ہے۔ لہٰذا ان لوگوں کی عظیم اکثریت جو اپنی نجی زندگی غرض وحسد کی بنیاد پر کیے جانے والے فیصلوں کو جائز (legitimate) نہیں تصور کرتے نظام اقتدار کی ضمن میں حرص و حسد کی بنیاد پر کیے جانے والے فیصلوں کو نا صرف برداشت (Tolerate) کرتی ہے۔ بلکہ ان کو معقول اور جائز بھی تصور کرتی ہے۔ لہٰذا جب عوامی جدوجہد سرمایہ کی غیر لبرل تنظیمی اقدار مثلاً قوم پرستانہ یا اشتراکی تنظیم اقتدار کے خلاف برپا کی جاتی ہے تو عوام کا سیاسی مقصد لبرل دستوری حقوق اور شخصی سیاسی آزادی اور معاشی ترقی کا حصول ہی ہوتا ہے۔ اس کی تازہ ترین مثال مصر، تیونس اور لیبیا کے انقلابات ہیں۔ ان تمام انقلابیوں کی جدوجہد میں اسلامی قوتوں بالخصوص اخوان المسلمون نے اہم کردار ادا کیا ہے لیکن یہ اسلامی قوتیں لبرل سیاسی تصورات کی تنفیذ کی مدعی ہیں۔ ان سب کا ماڈل ترکی کی Justice and Development پارٹی ہے اور وہ اس بات کے دعویدار ہیں کہ مصر، تیونس وغیرہ میں حکومت میں تو اسلامی شرع نافذ ہو لیکن ریاست خالص سیکولر اور لبرل بنائی جائے۔ ایران اور سوڈان کی ریاستوں کو بھی لبرل جمہوریت سے شدید خطرہ ہے۔ ان ممالک میں لبرل قوتوں کو عوام کی ایک بڑی تعداد (بشمول علماء) کی حمایت حاصل ہے اور ان کی موثر پشت پناہی امریکی استعمار کررہا ہے۔ حال ہی میں سوڈان اپنا آدھا حصہ لبرل قوتوں کے ہاتھوں شکست کھا کر کھو بیٹھا ہے۔

سوشلزم کیا ہے؟

سوشلزم کی تاریخ: سوشلزم، لبرل ازم اور قوم پرستی کی طرح سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کو جواز فراہم کرنے والا ایک نظریہ ہے۔ سوشلزم بذاتِ خود کوئی نظامِ زندگی نہیں، سوشلزم کے چند بنیادی تصورات کی جڑیں قدیم یونانی اور ایرانی مفکرین کے یہاں ملتی ہیں۔ اور اسی وجہ سے علامہ اقبال نے سوشلزم کو ''مزدکیت'' کہا ہے۔

مزدک نے زرتشت کی تعلیمات کے خلاف بغاوت کی اور انفرادی ذاتی ملکیت کو حرام قرار دیا۔ افلاطون کا تصورِ ریاست بھی اسی خصوصیت پر مبنی تھا جو اشتراکی تصورِ ریاست سے مماثل ہے۔ لیکن جس نظریہ کو اشتراکیت (socialism) کہتے ہیں اس کی ابتداء انیسویں صدی میں ہوئی۔ اس نظریہ کی دو تعبیریں پیش کی گئیں Owen Foureir, Morris, Prodhoun نے Socialist idialism اور Marx اور Engles نے Seientific Socialism کی تعبیر پیش کی۔ ان دونوں نظریات میں مشترکہ عقیدہ ذاتی ملکیت کی نفی تھی اور دونوں نظریات سرمایہ دارانہ ظلم اور استحصال کے خاتمے کے لیے ذاتی ملکیت کے خاتمہ کو ضروری سمجھتے تھے۔ socialist idealists کا خیال تھا کہ ذاتی ملکیت ختم کرنے کے لیے وسیع پیمانے پر تبلیغ کی ضرورت ہے۔ اور اس کے نتیجے میں لوگ خود بخود ذاتی ملکیت ترک کردیں گے اور اجتماعی ملکیت کے اصولوں پر کاروباری زندگی کو مرتب کریں گے۔ اس کی عملی مثال Robert Owen نے اپنے کارخانہ میں پیش کی۔

Seientific Socialism کا نظریہ تھا کہ ذاتی ملکیت کا خاتمہ انسانی تاریخی عمل سے لازماً برآمد ہوگا Socialist مادہ پرست (Materialist) ہوتے ہیں۔ اور اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ مارکس کے تصورات نے ارتقائے تاریخِ انسانیت کا سائنسی تجزیہ اسی حیثیت سے کیا ہے جس حیثیت سے Darwin نے نظریہ ارتقاء ثابت کیا ہے۔ مارکس اپنے آپ کو بنیادی طور پر ایک سائنس دان سمجھتا تھا اور اس نے اپنی سب سے اہم تصنیف ''داس کیپیٹل'' کو بھی Darwin کے نام ہی منسوب کیا تھا۔

Sceentific socialist شخصی ملکیت کے خاتمے کو انسانی تاریخی عمل کا ایک لازمی نتیجہ سمجھتے ہیں لیکن یہ عمل خود بخود آگے نہیں بڑھتا۔ اس عمل کو آگے بڑھانے کے لیے انسانیت کا ایک نمایندہ (Representative) طبقہ جدوجہد کرتا ہے۔ اس طبقہ کو Prolitariat کہتے ہیں۔ اور جب یہ طبقہ اپنی آمریت (dictator ship) قائم کرلیتا ہے تو ذاتی ملکیت ختم ہوجاتی ہے۔

Socialist idealists سوشلسٹ نظریات پچھلی تین صدیوں سے موجود ہیں۔ دنیا کی تمام سوشل ڈیموکریٹک پارٹیوں نے Socialist idealist نظریات اپنائے ہیں۔ ان پارٹیوں میں انڈین کانگریس، پاکستان پیپلز پارٹی، برطانوی لیبر پارٹی، فرانسیسی سوشلسٹ پارٹی وغیرہ شامل ہیں۔ یہ سب اصولاً انفرادی ملکیت کی ریاستی تحدید کی قائل ہیں۔ لیکن اس عمل کو عوامی مقبولیت سے مشروط کرتی ہیں۔ سوشلسٹ ڈیموکریٹک نظریات تیزی سے فروغ پا رہے ہیں اور ان لبرل نظریات میں ادغام کا عمل اقوام متحدہ اور اس کے ذیلی ادارہ مثلاً آئی ایم ایف، ڈبلیو ٹی او، وغیرہ کے ذریعہ فروغ پا رہا ہے۔

سوشل ڈیموکریٹک فکر نے اسلامی جماعتوں کو بھی بہت بری طرح متاثر کیا ہے۔ ان جماعتوں کے زعماء مثلاً راشد غنوشی، احمد غزالی، جلال الدین احمد، خرم جاہ مراد، پروفیسر خورشید احمد ایک مدت سے سوشل ڈیموکریٹک مباحث کی اسلام کاری میں مصروف ہیں۔ ۲۰۱۲ء کے مصری انتخابات میں اخوان المسلمون کا منشور اور ۲۰۰۲ء کے انتخابات میں ایم ایم اے کا منشور بے شمار سوشل ڈیموکریٹک مطالبات کا مجموعہ تھا۔

Scientific socialist نظریات کو قبول کرنے والی کیمونسٹ جماعتیں ہیں۔ ان جماعتوں نے روس، چین، کیوبا اور کئی دیگر ممالک میں سوشلسٹ انقلابات برپا کیے ہیں۔ اور Prolitariat کی Dictator ship قائم کرکے ذاتی ملکیت ختم کردی۔ لیکن ۱۹۸۹ء کے بعد سے ان جماعتوں کو شکستوں کا سامنا کرنا پڑا اور پورے مشرقی یورپ، چین اور کیوبا میں نجی ملکیت کا احیاء ہوا۔ چین اور کیوبا کے علاوہ ہر جگہ لبرل نظریات اور لبرل نظامِ ریاست غالب آگیا اور آج scientific socialism کے دعوے دار اپنے بہت سے نظریات سے انحراف کرنے پر مجبور ہوگئے ہیں۔

۲......سوشلسٹ انفرادیت:

سوشلزم ایک سرمایہ دارانہ نظریہ ہے لہٰذا سوشلسٹ، لبرل اور قوم پرست نظریات میں بنیادی اعتقادی ہم آہنگی ہے۔ سوشلسٹ نظریات کے حامل افراد لبرلوں اور قوم پرستوں کی طرح ''لا اللہ الا انسان'' کے کلمۂ خبیثہ پر ایمان رکھتے ہیں۔ سوشلسٹوں، لبرلوں اور قوم پرستوں کا مقصدِ زندگی آزادی کے فروغ کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ یہ تینوں نظریات انسان کو صمد اور قائم بالذات بنانا چاہتے ہیں اور ہر فرد کو اس بات پر راضی اور مجبور کرنا چاہتے ہیں کہ وہ دنیا میں زیادہ سے زیادہ لذت حاصل کرنے کو اپنے مقصدِ اولیٰ کے طور پر قبول کرلے اور تصرف فی الارض کی جدوجہد میں اپنی تمام توانائی کو کھپادے۔ سوشلزم، لبرلزم اور قوم پرستی انہی معنوں میں کفر ہیں کہ یہ تینوں نظریات الوہیت انسان کا عقیدہ رکھتے ہیں اور آخرت سے انکار کرکے دنیا میں حصولِ لذات کو انفرادی اور معاشرتی عمل کا محور اور مرکز بنادیتے ہیں۔ تینوں نظریات بڑھوتری سرمایہ برائے بڑھوتری سرمایہ کو آزادی اور الوہیتِ انسان کے اظہار کا واحد قابلِ عمل ذریعہ تصور کرتے ہیں۔

لبرل، قوم پرست اور سوشلسٹ تصورِ انفرادیت میں فرق بھی ہے۔ لبرل نظریہ کے مطابق ہر فرد اپنی ذات میں خدا ہے اور تمام اجتماعیتوں کے قیام کا جواز فرد کی الوہیت اور آزادی کا فروغ ہے۔ ہر فرد ایسے بنیادی حقوق رکھتا ہے کہ جن کو کسی اجتماعی مفاد کی بنیاد پر پامال نہیں کیا جاسکتا۔ انسان کا سب سے بنیادی حق ذاتی ملکیت کا حق ہے۔ وہ اپنے مادی وسائل کو جس طرح چاہے خرچ کرے بشرطیکہ اس استعمال سے کسی فرد کا یہی مساوی حق پامال نہ ہوتا ہو۔ لبرل مفکرین کے نزدیک معاشرہ اور ریاست کے وجود کا جواز یہی ہے کہ شخصی ملکیت کے حق کو فروغ دے۔

قوم پرست اور سوشلسٹ انفرادی الوہیت کے قائل نہیں۔ بلکہ وہ اجتماعی الوہیتِ انسانی کے قائل ہیں۔ قوم پرستوں کے مطابق

الوہیت انسانی کا مظہر ''قوم'' ہے انفرادی شخصیت نہیں۔ ہر مہاجر کو مہاجر قوم کی الوہیت کے فروغ کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنے پر ہر وقت راضی رہنا چاہیے۔ بنیادی حقوق قوم کے ہوتے ہیں اور قوم کی الوہیت کے حق کے سامنے اس کے تمام افراد کو اپنے انفرادی بنیادی حقوق سے دستبردار ہو جانا چاہیے۔

سوشلسٹ الوہیتِ انسانی کا مظہر نہ فرد کو مانتے ہیں نہ قوم کو بلکہ سوشلسٹ نظریہ کے مطابق الوہیتِ انسانی کا مکلّف ایک طبقہ ہے یہ طبقہ Prolitariat ہے۔ یہ طبقہ سوشلسٹ کہتے ہیں کہ انسانیت کا نمائندہ (Representative) طبقہ ہے اور الوہیتِ انسانی کا بنیادی حق اسی طبقہ کو حاصل ہے۔ جب Prolitariat طبقہ اپنی ڈکٹیٹرشپ قائم کرتا ہے تو وہ ذاتی ملکیت کو ختم کر کے تمام انسانوں کے مساوی حقوق کا اثبات کرتا ہے اور بنی نوع انسان کا ہر فرد وسائل کائنات سے یکساں مستفید ہونے کا مکلّف ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ہر فرد کا یہ فرض ہے کہ وہ پرولتاری ڈکٹیٹرشپ قائم کرنے کی جدوجہد میں شریک ہو اور اس کے قیام کے بعد پرولتاری قیادت کے احکام کو تسلیم کرے۔ اسی تابع داری میں الوہیتِ انسان کا صحیح اظہار ممکن ہے۔

۳.....سوشلسٹ معاشرہ:

انقلابِ روس کے اولین دور میں لینن اور اسٹالن نے سوشلسٹ انفرادیت کا تصور پیش کیا اس نظریہ جو کہ مارکس کے تصور Specie being سے ماخوذ تھا کے مطابق جیسے جیسے سوشلسٹ نظام مستحکم ہوگا ویسے ویسے روس کا ایک عام باشندہ ''Soveit man'' بن جائے گا۔ Maoze dong کا ۱۹۶۶ء تا ۱۹۷۴ء تک کا ثقافتی انقلاب بھی سوشلسٹ انسانی شخصیت کی تعمیر کی ایک کوشش تھی۔ Soveit man ایک ایسی انفرادیت تصور کی گئی جو طبقہ Proletariat کے مفادات کو ہمیشہ اپنے ذاتی مفادات پر ترجیح دیتی اور Prolitariat کی آزادی اور الوہیت کو فروغ دینے کو ہمہ وقت تیار رہتی ہو۔

عملاً اس قسم کی شخصیت کا سوویت روس، چین کے علاوہ کسی اور سوشلسٹ ملک میں وجود دیرپا ثابت نہیں ہوا۔ انقلاب کے ابتدائی دور میں بہت بڑی تعداد میں کمیونسٹ پارٹی کے اراکین نے اشتراکی اقتدار اور غلبہ کو قائم رکھنے کے لیے عدیم المثال قربانیاں پیش کیں۔ لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا قربانی کا یہ جذبہ سرد پڑتا گیا اور سوشلسٹ معاشرہ خود غرضی، لالچ اور حسد سے بھر کر رہ گیا۔ کیمونسٹ پارٹی کے اعلیٰ ترین افراد بدترین کرپشن اور بے راہ روی کا شکار ہو گئے۔ اس کی واضح ترین مثالیں لینن، اسٹالن اور ماؤ نے فراہم کیں۔ جو نہایت ظالم، خود غرض، سفاک اور بد دیانت حکمران ثابت ہوئے۔

سوشلسٹ اور لبرل معاشروں کی اخلاقی پستی یکساں ہے۔ دونوں معاشروں میں حرص اور حسد کا راج ہوتا ہے اور لوگ ایک دوسرے کی مجبوریوں اور کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر اپنا مطلب نکالتے ہیں۔ سوشلزم کا یہ دعویٰ کہ ذاتی ملکیت کو ختم کر کے سرمایہ دارانہ ظلم کو ختم کیا جا سکتا ہے قطعاً غلط ثابت ہوا۔ لینن، اسٹالن اور ماؤ نے بڑے پیمانے پر نجی کاروبار کو ختم کر کے معاشی عمل کی بنیاد ریاستی منصوبہ بندی پر رکھی۔ لیکن اس سے سرمایہ دارانہ ناانصافیوں میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ ایک منصوبے کے تحت معیشت (Planned economy) میں اقتدار نجی سرمایہ داروں کے ہاتھوں سے نکل کر ریاستی نوکر شاہی کے ہاتھ میں منتقل ہو گیا۔ اور ریاستی نوکر شاہی بھی اپنے اقتدار کو استعمال کر کے معیشت کو لُوٹنے میں مصروف ہو گئی۔ لبرل اور سوشلسٹ معاشرہ میں عام آدمی بھی استحصال پسند، خود غرض، لالچی اور عیاش ہوتا ہے۔ دونوں معاشروں میں قدرِ مشترک جنسی بے راہ روی اور ہوس پرستی ہے۔ اخلاقی اور روحانی پستی کے لحاظ سے ایک عام سوشلسٹ شہری ایک لبرل شہری سے ذرہ برابر مختلف نہیں ہوتا۔

سوشلسٹ ممالک کے عوام نے ریاستی منصوبہ بندی کو معاشی استحصال کا ذریعہ گردانا اور ۱۹۸۹ء کے بعد یکے بعد دیگرے سوشلسٹ معیشتیں لبرل بن گئیں، ریاستی منصوبہ بندی کو تدریجاً ترک کر دیا گیا اور ہر جگہ اجارہ دارانہ مارکیٹ (Monopolistic Markets) کا غلبہ ہو گیا۔ یہ عمل روس اور مشرقی یورپ میں مکمل ہو چکا ہے۔ اور آج نہایت زور و شور سے چین، کیوبا، وینزویلا اور بولیویا میں جاری ہے۔ سوشلسٹ ممالک جو آسانی سے لبرل بن گئے ہیں اور بنتے جا رہے ہیں یہ اس بات کی فیصلہ کن دلیل ہے کہ سوشلسٹ اور لبرل اخلاقیات میں کوئی بنیادی فرق موجود نہیں۔ سوشلسٹ اور لبرل معاشروں کی روحانی اور اخلاقی کیفیت یکساں ہوتی ہے۔ لہٰذا ادارتی صف بندی میں عمومی تبدیلی کے ذریعے سوشلسٹ معاشرے کو لبرل اور لبرل معاشرہ کو سوشلسٹ بنایا جا سکتا ہے۔

۴.....سوشلسٹ ریاست:

سوشلسٹ ریاست یا تو سوشل ڈیموکریٹک ہوتی ہے یا Proletarian Dictatorship۔ سوشل ڈیموکریسی میں مزدور تنظیمیں حکومت میں سرمایہ داروں کی حلیف اور ساتھی ہوتی ہیں۔ سیاسی عمل میں مزدور تنظیموں کی شمولیت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ سرمایہ دارانہ عمل کے فروغ میں وہ رکاوٹ نہ ڈالیں اور اقتدار میں شرکت سے اس بات کو یقینی بنائیں کہ مزدور بھی سرمایہ کی بڑھوتری کے عمل سے مستفید ہوں۔ سوشل ڈیموکریٹک ریاست میں اس بات کی دانستہ کوشش کی جاتی ہے کہ مزدور سرمایہ دار بن جائے۔ وہ حرص اور حسد کو قدر کے طور پر قبول کرلے اور انفرادی فیصلہ سرمایہ دارانہ عقلیت کی بنیاد پر کرے۔ مزدور سرمایہ کی بڑھوتری برائے بڑھوتری کے عمل کو عقل کا تقاضا سمجھے اور اپنا مفاد اس بات میں جانے کہ سرمایہ کی بڑھوتری تیز سے تیز تر ہوتی چلی جائے۔ کیوں کہ جتنا یہ عمل تیز ہوگا اتنا ہی خواہشات نفسانی کے حصول کے ذرائع پیدا ہوں گے۔ اور مزدور زیادہ سے زیادہ تصرف فی الارض کے مکلّف ہوں گے۔

پرولتاری ڈکٹیٹرشپ میں عوامی جمہوریت قائم ہوتی ہے۔ حکمران جماعت پرولتاری طبقہ کی نمائندگی کا دعویٰ کرتی ہے اور پرولتاری طبقہ انسانیت کی نمائندگی کا دعویٰ کرتا ہے اس ریاست میں بھی فیصلے عوام کی خواہشات کی تکمیل کے لیے کیے جاتے ہیں اور چوں کہ خواہشات کی تکمیل کا واحد ذریعہ بڑھوتری سرمایہ ہی ہے لہٰذا ریاستی عمل اور پالیسی کا جواز بڑھوتری سرمایہ ہی قرار پاتی ہے۔ لبرل اور سوشلسٹ ریاستی ڈھانچوں کی یہی مماثلت اس بات کی ضمانت فراہم کرتی ہے کہ لبرل اور سوشلسٹ ریاستوں میں کبھی جنگ نہیں ہوتی۔ آج دنیا میں چین امریکا کا سب سے بڑا حلیف ہے۔ اس نے کبھی بھی امریکی بربریت کا براہ راست مقابلہ نہیں کیا۔ نہ افغانستان میں، نہ عراق میں، نہ لاطینی

امریکا میں، نہ مشرق بعید میں۔ اس کے برعکس چین نے کھربوں ڈالر امریکا میں رکھے ہوئے ہیں جو امریکی معیشت کا بہت بڑا سہارا ہیں۔

۵......اسلامی سوشلزم:

سوشلزم، لبرل ازم اور قوم پرستی کفریہ نظریات ہیں۔ یہ اسلام کا رڈ ہیں کیوں کہ ان تینوں نظریات کا مشترکہ کلمہ لا الہ الا انسان ہے۔ لیکن ان تینوں نظریات نے مسلم مفکرین اور اسلامی جماعتوں کو متاثر کیا ہے۔ برصغیر میں سوشلزم کا اثر اسلامی فکر پر پہلی جنگِ عظیم کے دوران شروع ہوا۔ جب تحریک ریشمی رومال کی پسپائی کے بعد چند علماء اور مجاہدین ہجرت کر گئے۔ اور ان میں سب سے اہم قائد مولانا عبید اللہ سندھی ترکی کے راستے روس پہنچے، ہندوستان واپس آ کر آپ نے بہت سے سوشلسٹ نظریات کی اسلام کاری کی کوشش کی۔ سندھ کے دیو بندی علماء فکری طور پر اب بھی اس فکر سے کچھ نہ کچھ متاثر ہیں۔ اسی طرح ذوالفقار علی بھٹو کے ''اسلامی سوشلزم'' سے بھی متاثر ہیں۔ ہمارے نزدیک سوشل ڈیموکریٹک ایجنڈا کی اسلامی جماعتوں کے منشور میں شمولیت بھٹو اور اس کے پیروکاروں سے مرعوبیت ہی ہے۔

ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ لبرل ازم اور قوم پرستی کی طرح سوشلزم بھی جاہلیت خالصہ اور کفرِ لعین ہے۔ اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں، سوشلسٹ اسلام کے بدترین دشمن ہیں کیوں کہ وہ خدا کے دشمن ہیں۔ ہم سوشلسٹ نظریات کو اُکھاڑ پھینکنے کا عزم رکھتے ہیں۔

سوشلسٹ اور اسلامی نظریات کا فرق

اسلام	سوشلزم
عقیدہ: لا الہ الا اللہ	لا الہ الا انسان
اقدار: تقویٰ انفاق فی سبیل اللہ	حرص و حسد اور غضب حضرتِ شہوانی شیطانیت کا غلبہ
شخصیت: روحانی عبدیت کا مظہر	حیوانی: شیطانی نسبت کا غلبہ
معاشرہ: مرکز اور محور ماں کی ذات، خاندانی نظام اور شخصی ملکیت کا فروغ، معاشرہ مقصد حصولِ رضا الٰہی	مرکز اور محور طبقہ اور اس کی نمائندہ جماعت شخصی ملکیت کی نفی سرمایہ دارانہ (ریاستی اور کارپوریٹ ملکیت کا فروغ بذریعہ منصوبہ بندی (Planing) اہداف کا حصول)
ریاست: خلافت اور امارت۔ شخصی حکومت شریعت اور علوم اسلامی کی بالادستی	ریاست Dictatorship of Prolitoried یا Social democracy عوام یا طبقہ کی نمائندہ حکومت طبقاتی حقوق کا فروغ۔ ارادۂ عمومی General Will کی حکمرانی

سوشل ڈیموکریسی کیا ہے؟

سوشل ڈیموکریسی کی تاریخ:

سوشل ڈیموکریسی (Social Democracy) لبرل ازم اور سوشلزم کا ایک ملغوبہ ہے اور سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کا ایک مقبولِ عام نظریہ ہے۔ اس نظریہ کے بانی انیسویں صدی کے فرانسیسی فلسفی تھے بالخصوص Proudhon اور Fourier۔ فرانس کے بادشاہ Louis Napoleon iii, نے اس نظریہ کی بنیاد پر بہت سی ریاستی پالیسیاں بھی انیسویں صدی میں وضع اور نافذ کیں۔

انیسویں صدی کے آخری چوتھائی حصہ میں یہ نظریہ جرمنی میں بھی عام ہوا اور Marx کی زندگی میں ہی اس کی بنائی ہوئی تنظیم First Communist International میں ایک مضبوط سوشل ڈیموکریٹ دھڑا اُبھر کر سامنے آیا جس نے بالآخر اس تنظیم پر قبضہ کر لیا۔ جرمنی کی کیمونسٹ پارٹی اس زمانہ میں دنیا کی سب سے بڑی کیمونسٹ جماعت تھی۔ اس پارٹی پر بھی Social Democrat قابض ہو گئے۔ ان کی قیادت Eduara Bernstein اور Karl Kautsky کر رہے تھے۔ روس کی کیمونسٹ جماعت بھی بیسویں صدی کی ابتدا میں دو حصوں میں تقسیم ہو گئی اور سوشل ڈیموکریٹ Martow کی قیادت میں اس جماعت کے Memshevik دھڑے پر قابض ہو گئے لینن ان کا شدید ترین مخالف تھا۔

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں برطانیہ، اٹلی، اسپین اور اسکنڈے نیوین (Scandinavian) ممالک میں طاقت ور سوشل ڈیموکریٹ جماعتیں قائم ہوئیں۔ پہلی جنگ عظیم کے دور میں تقریباً تمام یورپی ممالک میں سوشل ڈیموکریٹ جماعتوں نے اپنے ملک کی قوم پرست حکومتوں کا ساتھ دیا اور ۱۹۱۹ء - ۱۹۴۵ء کے دور میں یہ حکومتوں میں شریک رہیں۔ جرمنی کی نازی (Nazi) پارٹی بھی سوشل ڈیموکریٹ پالیسیاں اپناتی تھی اور Hitler اور Mussolini خود کو National Socialist سمجھتے تھے۔

۱۹۴۵ء سے ۱۹۷۹ء تک پورے مغربی یورپ اور امریکا میں سوشل ڈیموکریسی غالب حکومتی نظریہ کے طور پر اپنائی گئی۔ اس دور میں جس نظریہ نے سوشل ڈیموکریٹک پالیسیوں کی توجیہہ پیش کی وہ Keynesianism ہے اور Kenynesian پالیسیوں کو ریاستی سطح پر سب سے پہلے امریکی صدر Franklin Roosevelt نے اپنایا۔ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۷۹ء کے دور میں کئی یورپی ممالک میں اور امریکا میں بھی سوشل ڈیموکریٹک حکومتیں قائم ہوئیں۔ یہ دور سرمایہ داری کا زریں دور (Golden age) کہلاتا ہے۔

۱۹۷۹ء سے ۲۰۰۷ء تک سوشل ڈیموکریٹ پالیسیاں بتدریج ریاستی سطح پر رد کی گئیں اور امریکا اور کئی یورپی ممالک میں لبرل پالیسیوں کا احیاء ہوا۔ ۲۰۰۷ء کے بعد سے یورپ اور امریکا مالیاتی اور ریاستی قرضہ جات کے بحرانوں کا شکار رہے۔ جس کے نتیجہ میں لبرل اور سوشل

ڈیموکریٹ پالیسیوں کی ایک مخلوط تشریح جزوی طور پر ظاہر ہورہی ہے۔ معیشت میں ریاستی مداخلت کی نظمِ نو کو ممکن بنانے کی ایسی کوشش ہورہی ہے جو سرمایہ دارانہ عدل کے حصول کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو۔

سوشل ڈیموکریٹک نظریات ایشیا افریقا اور جنوبی امریکا میں بھی ۱۹۴۵ء کے بعد بہت مقبول ہوئے۔ یہاں کی قوم پرست حکومتیں...... ہندوستان، مصر، انڈونیشیا، ارجنٹینا، ترکی، برازیل وغیرہ عموماً سوشل ڈیموکریٹ پالیسیاں اختیار کرتی رہیں ہیں۔ پاکستان کی سب سے اہم سوشل ڈیموکریٹک جماعت پیپلز پارٹی ہے، گوکہ سوشل ڈیموکریٹک پالیسیاں ایوب خان، مشرف، نواز شریف وغیرہ نے بھی اختیار کی ہیں۔ جماعتِ اسلامی اور جمعیتِ علمائے اسلام بھی سوشل ڈیموکریٹک نظریات سے شدید متاثر ہوئی ہیں۔ جماعت اسلامی کے مفکرین، پروفیسر خورشید احمد، نجات اللہ صدیقی، عمر چھاپرا نے سوشل ڈیموکریسی کی اسلام کاری کی کوشش اسلامک اکنامکس (Islamic Economics) کا مضمون وضع کر کے کی ہے جو آج بیشتر پاکستانی جامعات میں شاملِ نصاب ہے۔

یورپی کیمونسٹ پارٹیاں بھی سوشل ڈیموکریٹک نظریات سے بے حد متاثر ہوئی ہیں۔ یہ عمل ۱۹۷۰ء کی دہائی کے وسط سے شروع ہوا جب فرانس اور اٹلی کی کیمونسٹ پارٹیوں نے Eurocommunism کا نظریہ اختیار کیا (اس نظریہ کی اساسی بنیاد Antonio Gramsci ۱۹۲۰ء کی دہائی میں وضع کر چکا تھا)۔ ۱۹۸۵ء کے بعد سوویت روس کے حکمراں گورباچوف (Gorbachev) نے سوشل ڈیموکریٹ پالیسیاں اختیار کیں۔ اب یورپ میں کیمونسٹ جماعتیں تاحال معدوم ہوگئی ہیں۔ وہ اکیلا کیمونسٹ ملک جس نے سوشل ڈیموکریٹ پالیسیاں اختیار نہیں کیں وہ چین ہے اور چین کے ریاستی نظام کے استحکام کی یہ ایک اہم وجہ ہے۔

سوشل ڈیموکریٹک انفرادیت:

سوشل ڈیموکریسی ایک سرمایہ دارانہ نظریہ ہے، لہٰذا اس کے کلیدی تصورات اس تنویری فکر (Enlightenment) سے نکلتے ہیں جس سے لبرل قوم پرست اور سوشلسٹ کلیدی تصورات برآمد ہوتے ہیں۔ سوشل ڈیموکریسی کا کلمہ بھی ''لا الٰہ الا الانسان ہے''۔ سوشل ڈیموکریسی کا مقصد لامتناہی فروغ آزادی یعنی بڑھوتریٔ سرمایہ برائے بڑھوتریٔ سرمایہ کے علاوہ کچھ نہیں۔ لبرل ازم اور سوشلزم کی طرح سوشل ڈیموکریسی بھی اصلاً اور اصولاً ایک مادہ پرست (Materialist) نظریہ ہے اور اس کا مقصد بھی انسان کی خواہشات کو تمام کائنات پر مسلط کرنا اور جلد از جلد زیادہ سے زیادہ تمتع فی الارض کو ممکن بنانا ہے۔ سوشلسٹ، قوم پرست، لبرل اور سوشل ڈیموکریٹ سب اس بات پر متفق ہیں کہ انسان کے اندر خود تخلیقیت اور تخلیقیتِ کائنات (Self and Reality Creation) کی صلاحیت موجود ہے اور عقل (Pure Reason) کا یہ تقاضا ہے کہ وہ حق کو اپنی خواہش کے مطابق تخلیق کرے۔ لہٰذا قوم پرست، لبرل، سوشلسٹ اور سوشل ڈیموکریٹ سب ذلیل ترین کافر ہیں۔ کیوں کہ یہ تو شرک سے بھی آگے کی ایک منزل ہے اور خدائی کا دعویٰ تو ابلیس نے بھی نہیں کیا اور اسی چیز کو مولانا مودودی نے ''جاہلیتِ خالصہ'' بتایا ہے (دیکھئے اسلامی تہذیب کے اصول ومبادی)

لبرل اور سوشل ڈیموکریٹ تصورِ انفرادیت میں فرق بھی ہے۔ لبرل مفکرین فرد کو خود غرض اور قائم بالذات تصور کرتے ہیں۔ لبرل نظریہ کے مطابق ہر فرد اپنی انفرادی آزادی/سرمایہ کی بڑھوتری کے لیے مستقل جدوجہد کرتا ہے۔ وہ دوسرے افراد کو اپنے حصولِ سرمایہ/آزادی کا ذریعہ تصور کرتا ہے اور خود بھی دوسروں کی جدوجہدِ بڑھوتریٔ سرمایہ/آزادی میں آلہ کار بننے پر راضی ہوتا ہے۔ اس ہی بنیاد پر لبرل معاہدات (Contract) وضع کیے جاتے ہیں۔

سوشل ڈیموکریٹ فرد کو خود کفیل (Autonomous) تصور نہیں کرتا بلکہ انسانیت کو بحیثیتِ نوع خود کفیل اور قائم بالذات تصور کرتا ہے۔ سوشلزم کی طرح سوشل ڈیموکریٹ بھی خود تخلیقیت کے عمل کا اظہار پیداوار (Production) میں دیکھتا ہے۔ انسان اپنی ذات کی تخلیق خام مادہ (Raw Materials) میں اپنی محنت (Labour) کو ملا کر کرتا ہے اور Production کا عمل ہی اظہارِ تخلیقِ ذات ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام زندگی میں انسانیت دو عظیم طبقوں (Classes) میں تقسیم ہوجاتی ہے۔ مزدوروں کا طبقہ جو صرف اپنی محنت (Labour) کا مالک ہوتا ہے اور سرمایہ داروں کا طبقہ جو تمام ذرائع پیداوار کا مالک ہوتا ہے۔ سوشلسٹ بھی اس نظریہ کے قائل ہیں لیکن سوشلسٹوں کی رائے میں مزدوروں اور سرمایہ داروں میں نزاع (Conflict) کو ختم کرنے کے لیے ایک ایسے ریاستی انقلاب کی ضرورت ہوتی ہے جو سرمایہ داروں کے طبقہ کو ختم کردے اور Dictatorship of the Prolitariat کے ذریعہ سرمایہ دارانہ ریاستی ملکیت قائم کردے۔

سوشل ڈیموکریٹ اس انقلاب کی ضرورت کے قائل نہیں۔ ان کی رائے میں جیسے جیسے سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی ترقی کرتا ہے طبقاتی کشمکش کمزور ہوتی جاتی ہے اور ہر شخص سرمایہ کا آلہ کار (یعنی مزدور) بن جاتا ہے۔ نجی سرمایہ دارانہ ملکیت کارپوریٹ (Corporate Capitalist) سرمایہ دارانہ ملکیت میں تحلیل ہوجاتی ہے اور یہ تبدیلی سرمایہ دارانہ علمیت (Epistimology) کے بتدریج غلبہ کے نتیجہ میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔

سوشلسٹ اور سوشل ڈیموکریٹ تصورِ انفرادیت میں بنیادی فرق یہ ہے کہ سوشلسٹ انفرادیت کو غضب اور حسد سے مغلوب تصور کرتے ہیں۔ سوشلسٹ نظریہ کے مطابق مزدور طبقہ کا ہر فرد سرمایہ دار طبقہ سے اتنی شدید نفرت کرتا ہے کہ یہ نفرت اس کی ہوس اور شہوت پر غالب آجاتی ہے اور فرد اور طبقہ کا عمل نفرت، حسد اور غضب کی بنیاد پر استوار ہوتا ہے۔ سوشلسٹ اور قوم پرستانہ اقداری مماثلت یہ ہے کہ دونوں نظریات فرد کو نفرت اور حسد کے جذبات سے مغلوب تصور کرتے ہیں اور ایک سوشلسٹ اور قوم پرست فرد حسد اور نفرت ہی کی بنیاد پر بڑی سے بڑی قربانی دینے پر تیار ہوتا ہے۔

اس کے برعکس سوشل ڈیموکریٹ انفرادیت کو حرص اور طمع سے مغلوب تصور کرتے ہیں حسد اور نفرت سے نہیں۔ سوشل ڈیموکریٹ اور لبرل تصورِ انسانیت میں بہت مماثلت ہے۔ سوشل ڈیموکریٹ نظریہ کے مطابق ہر فرد خواہ وہ مزدور ہو خواہ سرمایہ کار، بڑھوتریٔ سرمایہ سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہونے کی ابدی خواہش رکھتا ہے۔ لہٰذا وہ سرمایہ دارانہ عقلیت (Enlightenment Rationality) پر ایمان لے آتا ہے۔ یہ عقلیت خواہشاتِ نفسانی کے حصول کے سہل ترین طریقہ کی نشان دہی کرتی ہے اور اس کی مفروضات دُورس، آفاقی

(Universal) اور معروضی (Objective) ہیں اور ان پر عمل کرنے سے سب کا بھلا ہوتا ہے۔ سب کی خواہشاتِ نفسانی فروغ پاتی ہیں خواہ وہ مزدور ہو خواہ سرمایہ کار...... ہوس سے مغلوب عقلیت مزدوروں اور سرمایہ کاروں میں اشتراکِ عمل کا وہ طریقہ بتاتی ہے جس سے سرمایہ کی بڑھوتری برائے بڑھوتری تیز سے تیز تر کی جاسکے اور سب کی خواہشاتِ نفسانی خوب سے خوب تر فروغ پائیں۔ لہٰذا سوشل ڈیموکریٹ سرمایہ دارانہ طبقہ کے خلاف انقلاب برپا کرنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ سرمایہ داروں اور مزدوروں میں ایسے اشتراکِ عمل کے ممکنات کی نشان دہی کرتے ہیں جس کے نتیجے میں سرمایہ دارانہ عدل فروغ پائے۔

سوشل ڈیموکریٹک تصورِ معاشرت:

سرمایہ دارانہ عدل سے مراد یہ ہے کہ ہر فرد اپنی تمام خواہشاتِ نفسانی کے حصول کا ہنوز مکلّف ہوتا چلا جائے۔ لبرل کہتے ہیں کہ اس عدل کے حصول کے لیے بنیادی انسانی حقوق (Human Rights) کی فراہمی کافی ہے۔ یہ ہیومن رائٹس تحفظ سرمایہ دارانہ حیات (غیر سرمایہ دارانہ حیات کا تحفظ مقصود نہیں، مثلاً مشہور لبرل فلسفی جان لاک نے امریکا کے قدیم باشندوں (ریڈ انڈینز) کے قتلِ عام کو بالکل درست قرار دیا۔ تحفظِ سرمایہ دارانہ آرا (جان لاک نے اپنی مشہور دستاویز A Letter on Toleration میں مسلمانوں کو اشاعتِ آرا کے حق سے محروم کرنے کا جواز پیش کیا ہے)، اور تحفظِ سرمایہ دارانہ ملکیت سوشل ڈیموکریٹ کہتے ہیں، سرمایہ دارانہ عدل کے فروغ اور حصول کے لیے یہ کافی نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مارکیٹ (Market) کا عمل لازماً اجارہ داری (Monopolisation) کا شکار ہو جاتا ہے اور قیمتوں کا تعین مسابقتی عمل کے ذریعہ نہیں ہوتا اور سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کے قیام کے وقت جو تقسیمِ قوت میں عدمِ توازن ہوتا ہے اس میں بتدریج اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ کیوں کہ سرمایہ دارانہ عمل کے ذریعہ ارتکازِ دولت اور قوت لازماً فروغ پاتا ہے۔

تقسیمِ قوت کی سب سے بڑی ناہمواری، مزدوروں اور سرمایہ کاروں کے درمیان ہوتی ہے۔ انیسویں صدی میں یہ ناہمواری بہت شدید شکل میں سامنے آئی اور سرمایہ کارانہ ترقی کے نتیجہ میں مزدوروں کے مفادات میں اضافہ کی رفتار بہت سست رہی۔ اس دور کے Social Democrats نے اس عدمِ توازن کی وجہ یہ بتائی کہ مزدور کی مسابقتی قوت سرمایہ کار کے مقابلہ میں نہایت محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ سرمایہ کار جتنی کم اُجرت بھی دے مزدور اس کو قبول کرنے پر مجبور ہے۔ سرمایہ کار جب چاہے مزدور کی ملازمت ختم کر دے اور جتنی شدید مشقت مزدور سے چاہے لے۔ سرمایہ دارانہ عدل کا قیام ان حالات میں ناممکن ہے۔ گو کہ مزدوروں کو فرداً فرداً تمام ہیومن رائٹس (human Rights) میسر تھے۔

سوشل ڈیموکریٹک مفکرین کے مطابق سرمایہ دارانہ عدل کے قیام کے لیے ٹریڈ یونین (Trade Unions) کا قیام ضروری ہے۔ ٹریڈ یونین وہ ادارہ ہے جس میں مزدوروں کی قوت مجتمع کی جاتی ہے اور وہ سرمایہ دارانہ عدل کے لیے جستجو اجتماعی سودے بازی (Collective Bargaining) کے ذریعہ کرتی ہے۔ اس اجتماعی سودہ بازی کا مقصد سرمایہ کی بڑھوتری میں مزدوروں کے جائز حق کا حصول ہوتا ہے۔ Collective Bargaining کے ذریعہ مزدور اجتماعی سرمایہ کار بن جاتا ہے۔ وہ سرمایہ کار کا مخالف نہیں رہتا بلکہ خود سرمایہ دار بن کر ذریعۂ پیداوار کے مالک کا ساتھی بن جاتا ہے اور مالک سرمایہ دار اور مزدور سرمایہ دار اس بات پر سمجھوتا کرنے کی پیہم جستجو کرتے ہیں کہ منافع (Surplus) کی کونسی ایسی تقسیم سب سے سودمند ہے جس کے ذریعے مزدوروں کے مفادات میں اضافہ اس طریقے سے کیا جائے کہ بڑھوتریٔ سرمایہ کا عمل تیز سے تیز تر ہو سکے۔ یہی سرمایہ دارانہ عدل کا تقاضا ہے۔

ٹریڈ یونین (Trade Union) کے عروج کا دور ۱۸۹۰ء سے ۱۹۷۱ء تک کا ہے۔ اس زمانہ میں بیشتر مغربی یورپی ممالک میں ٹریڈ یونین کی مسابقتی قوت کو قانونی تحفظ حاصل تھا اور اس کی نظریاتی بنیاد (Keynesianism) کا فلسفہ فراہم کرتا تھا۔ مالکان ٹریڈ یونین کی ہڑتال (Strike) کے عمل سے خائف تھے اور بیشتر سوشل ڈیموکریٹ جماعتیں (جن میں کچھ عرصہ تک امریکا کی Democratic Party بھی شامل تھی) ٹریڈ یونین کے زیرِ اثر رہیں اور ٹریڈ یونین اور سوشل ڈیموکریٹک پارٹیوں کے تعاون ہی سے ۱۹۱۹ء میں جرمنی میں ۱۹۲۶ میں برطانیہ میں ۱۹۴۲ء میں اٹلی میں ۴۵-۱۹۴۲ء میں فرانس میں اور ۱۹۴۵ء میں یونان میں امریکی افواج نے کمیونسٹ انقلاب کو ناممکن بنایا۔ اس پورے دور میں اور آج تک یورپ کی سوشل ڈیموکریٹ جماعتیں امریکا کی ذلیل ترین کاسہ لیس حاشیہ بردار رہی ہیں۔ اس کی تازہ ترین مثال تو بلیر (Blair) اور Brown کی جماعتیں ہیں۔ لیکن امریکا کی چاکری کا سب سے واضح جواز Aunerin Bevan کی تحریرات میں ملتا ہے۔ Bevin ۱۹۴۵ء تا ۱۹۵۱ء کی برطانوی لیبر حکومت میں وزیر تھا Social Democratic انفرادیت میں شہوت اور ہوس کا غلبہ ہے۔ لہٰذا لبرل معاشرہ کی طرح سوشل ڈیموکریٹ معاشرہ بھی شہوت رانی اور ہوس پرستی میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ لبرل ازم اور سوشل ڈیموکریسی دونوں مذہب دشمن نظریات ہیں انہوں نے قدیم عیسائی معاشرہ کو یورپ میں بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا ہے اور جس معاشرت کو فروغ دیا ہے وہ نہایت غلیظ، پلید، گھناؤنی اور نجس معاشرت ہے۔ لبرل ازم اور سوشل ڈیموکریسی انسانی معاشرت کو حیوانیت میں ڈبونے کا ذریعہ بنے ہیں۔

۱۹۷۱ء کے بعد سے ٹریڈ یونینز کے زوال کا دور شروع ہوتا ہے اس کی سب سے بڑی وجہ کارپوریٹ ملکیت (Corporate Property) کا فروغ ہے۔ جیسے جیسے سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی فروغ پاتا ہے ذاتی ملکیت (Private Property) ختم ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور اس کی جگہ Corporate Property لے لیتی ہے کارپوریٹ ملکیت میں ملکیت (Ownership) اور اختیار (Control) کو علیحدہ کر دیا جاتا ہے۔ کارپوریشن کے قانونی مالک وہ لاکھوں افراد ہوتے ہیں جو کمپنی کے حصص (Shares) سٹہ کے بازار (Stock Market) میں خریدتے بیچتے رہتے ہیں یہ بالکل فرضی (Fictional) ملکیت ہوتی ہے کیوں کہ یہ لاکھوں افراد کارپوریشن کے کاروبار اور اس کی پالیسیوں کو متعین کرنے میں کوئی حصہ نہیں لے سکتے۔ ان کا سالانہ اجتماعِ عام (Annual General Meeting) محض ضابطہ کی کارروائی ہوتا ہے۔

کارپوریشن کے کرتا دھرتا اور بااختیار چلانے والے اس کے منیجر (Manager) ہوتے ہیں۔ ان منیجروں کا انتخاب ان کی اس صلاحیت کے مطابق کیا جاتا ہے کہ وہ کارپوریشن کو استعمال کرکے اس کے منافع میں کس تیزی سے اضافہ کر سکتے ہیں۔ ان

منیجروں کا انتخاب اور کسی بنیاد پر نہیں کیا جاتا۔ اگر وہ منافع میں مستقل اضافہ کرنے سے قاصر رہ جائیں تو ان کو ملازمت سے نکال دیا جاتا ہے کیوں کہ کارپوریشن کے دیوالیہ (Bankrupt) ہونے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام میں کارپوریشن ایک شخصِ قانونی (Legal Person) کی حیثیت اختیار کرتی ہے۔ اس کا مقصدِ وجود (Raison D'etre) صرف اور صرف اپنے سرمایہ کی رفتارِ بڑھوتری میں اضافے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ کارپوریشن سرمایہ کی تجسیم ہے۔ سرمایہ دارانہ (کارپوریٹ) ملکیت سے مراد سرمایہ کی ملکیت ہے۔ اس نظام میں مالک صرف سرمایہ یعنی حرص اور حسد ہوتا ہے۔ باقی سب منیجر، حصص رکھنے والے صارف، ملازمین، سرمایہ کے غلام ہوتے ہیں۔ وہ سب اس بات پر مجبور رہتے ہیں کہ اپنی تمام توانائیاں بڑھوتریٔ سرمایہ برائے بڑھوتریٔ سرمایہ کے مقصد کے حصول میں مستقل کھپاتے رہیں۔ وہ سب یہ کرنے پر زندگی بھر مجبور رہتے ہیں۔ آزادی کا یہی مطلب ہے۔ آزادی کا اور کوئی مطلب تاریخ میں واضح نہیں ہوا۔ تعجب ان پر ہے جو آزادی کو عبادت کے ہم معنی گردانتے ہیں۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

جب سب لوگ سرمایہ کے غلام بن جاتے ہیں تو طبقوں کا وجود لازماً بتدریج ختم ہو جاتا ہے۔ سب ہی سرمایہ کے غلام ہیں کیا مزدور کیا منیجر، کیا ریاست کا کارندہ (سرمایہ کی غلامی کا مقصد نفس کو حرص اور حسد کے شیطانوں کے سپرد کر دینا ہے) تو طبقاتی کشمکش لازماً لایعنی ہو جاتی ہے اور وہ واحد اجتماعیت جو سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی نے تعمیر کی تھی یعنی مزدوروں کی اجتماعیت اور جس نے مذہبی اجتماعیت کی جگہ لی تھی لازماً تحلیل ہو جاتی ہے۔ ان حالات میں سوشل ڈیموکریسی لبرل ازم میں ضم ہو جاتی ہے۔ کارپوریٹ ملکیت کے غلبہ کے نتیجہ میں سرمایہ دارانہ عدل قائم نہیں ہوتا ہے بلکہ ارتکازِ قوت اور دولت میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ گو کہ معاشرتی عمل (بالخصوص سرمایہ دارانہ تعلیم اور ہنر سازی (Education and Training) کے ذریعہ ہر فرد Human Capital بن جاتا ہے لیکن سرمایہ کی بڑھوتری کے عمل میں شمولیت کے مواقع بتدریج محدود ہوتے جاتے ہیں۔ لہٰذا دورِ حاضر کی سوشل ڈیموکریسی طبقاتی مسابقت کا ذریعہ نہیں سرمایہ دارانہ شمولیت (Capitalist Inclusiveness) کا جواز فراہم کرتی ہے۔

سوشل ڈیموکریسی کا تصورِ ریاست:

سوشل ڈیموکریسی جو سرمایہ دارانہ ریاست بناتی ہے اس کو ویلفیئر اسٹیٹ (Welfare State) کہتے ہیں۔ ابتداً سوشل ڈیموکریٹ سمجھتے تھے کہ ویلفیئر اسٹیٹ کے قیام کا بنیادی ذریعہ قومی کارپوریشن کا قیام ہوگا۔ چناں چہ Eduard Bernstein جو جرمنی کے اولین سوشل ڈیموکریٹ مفکرین اور مبلغین میں سے تھا جرمنی کے ریلوے نظام کو وہ ماڈل تصور کرتا تھا جو سرمایہ دارانہ نجی ملکیت کے متبادل کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۶۵ء تک کئی سوشل ڈیموکریٹک حکومتوں نے نجی سرمایہ دارانہ شعبوں کو قومی کارپوریشنوں کے طور پر چلایا لیکن عموماً یہ تجربہ ناکام ثابت ہوا۔ قومی اور نجی کارپوریشن کے عمل میں کوئی واضح فرق نہ تھا اور قومی کارپوریشنوں کی کارفرمائی کے نتیجہ میں سرمایہ دارانہ عدل کے فروغ میں کوئی خاطر خواہ اضافہ نہ ہوا۔ یہ بات واضح ہوگئی کہ نجی کارپوریشنوں کی طرح قومی کارپوریشنوں پر بھی سرمایہ کی ملکیت قائم رہتی ہے اور سرمایہ دارانہ مارکیٹ کے عمل کو طابع (Transcend) کرنے سے وہ بھی اتنی ہی قاصر (Ineffective) رہتی ہیں جتنی نجی کارپوریشنیں۔ سوشل ڈیموکریٹ حکومتوں نے اپنی مالیاتی (Fiscal) اور زری (Monitary) پالیسیوں کے ذریعہ ان لوگوں کے لیے جو بڑھوتریٔ سرمایہ کے عمل سے بالواسطہ متعلق نہ تھے یا اس سے خاطر خواہ استفادہ نہیں کر رہے تھے سہولیاتِ زندگی بالخصوص تعلیم، علاج، رہائش اور سفر کی سہولیات فراہم کرنے کی کوششیں کیں اور سوشل ڈیموکریٹ مفکرین نے کہا کہ Human Rights کے ساتھ ساتھ ریاست کو Social rights کی ضمانت بھی فراہم کرنی چاہیے اور ہر فرد کو ایک متعین معیارِ زندگی (Basic Standard of Living) پر گزر بسر کرنے کا مکلّف بنانا چاہیے اور اس متعین معیارِ زندگی میں مستقل اضافہ ہوتا رہنا چاہیے کیوں کہ سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی حصولِ لذات اور فروغِ شہوات کے لیے اختیار کیا جاتا ہے۔

چناں چہ سوشل ڈیموکریٹ اور لبرل ریاستی ڈھانچہ (Structure) میں کوئی واضح فرق برقرار نہ رہ سکا۔ سوشل ڈیموکریٹ ریاستیں لبرل ریاستوں کی طرح نمائندہ دستوری جمہوریتیں (Representative Constitutional Republic) ہوتی ہیں اور اب یونینوں کا ان سوشل ڈیموکریٹک ریاستی نظاموں میں کوئی خاص مقام باقی نہیں رہ گیا ہے۔ لہٰذا مالی وسائل جمع کرنے میں جو مشکلات لبرل ریاستوں کے سامنے آتی ہیں انہی مسائل کا سامنا سوشل ڈیموکریٹ ریاستوں کو بھی کرنا پڑتا ہے۔ سوشل ڈیموکریٹک حکومتوں کی مالی ضرورتیں لبرل حکومتوں سے زیادہ ہوتی ہیں کیوں کہ لبرل حکومتوں کی طرح سوشل ڈیموکریٹ حکومتیں سرمایہ دارانہ نہ ختم ہونے والی عالمی جنگی مہمات کا بوجھ اٹھاتی ہیں۔ وہ سب امریکا کی باج گزار حلیف ریاستیں ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ سوشل ڈیموکریٹ حکومت کو عوام کی ایک بڑھتی ہوئی اکثریت کے لیے ایک بڑھتا ہوا معیارِ زندگی بھی فراہم کرنے کی ذمہ داری اٹھانا پڑتی ہے۔ لیکن لبرل حکومتوں کی طرح ان کی محصولیاتی صلاحیت (Taxation Capability) جمہوری عمل کی پابند اور لازماً محدود ہوتی ہے۔

بیشتر سوشل ڈیموکریٹ حکومتیں جلد یا بدیر ریاستی مالیاتی بحران (Fiscal Crises of the State) کا شکار ہوتی ہیں۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔

۱...... چوں کہ سرمایہ دارانہ عمل لازماً سرمایہ کی مرکزیت (Concentration) کو فروغ دیتا ہے اور سرمایہ کی بڑھوتری (Accumulation) کا مطلب ہی اس کی Concentretion ہے لہٰذا جیسے جیسے سرمایہ دارانہ چکر تیز ہوتا جاتا ہے وہ زیادہ سے زیادہ افراد کو اپنے سے باہر پھینکتا چلا جاتا ہے۔ آج مغربی یورپ اور شمالی امریکا میں کوئی ایسا ملک موجود نہیں جہاں ٹیکس دینے والوں کی تعداد ٹیکس نہ دینے والوں سے زیادہ ہو۔ وہ لوگ جو اپنی گزر بسر کرنے کے لیے اتنا نہیں کماتے جو ان کی کفالت کر سکے۔ ایسے لوگ بچت کرنے والوں سے کئی گنا زیادہ ہیں اور ان کا حکومت کی امداد اور قرضوں کی بنیاد پر گزارا ہوتا۔ مغربی یورپ میں شرح بے روزگاری ۱۴ فی صد اور

امریکا میں ۸ فی صد ہے اور اس میں مستقل اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ لاکھوں کروڑوں بوڑھے بچے، طالب علم اور غریب (امریکا میں تقریباً ۲۰ فی صد آبادی غربت کی سطح (Below the povery line) پر زندگی بسر کرتی ہے) حکومت پر مستقل انحصار کرتے ہیں۔ ہر مغربی یورپی اور شمالی امریکی ملک میں حکومت کے سوشل اخراجات (Social Expenditure) نا قابلِ برداشت حد تک بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔

۲......دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ معیارِ زندگی کم کرنے کو تیار نہیں۔ مثلاً ہر فرد معیارِ زندگی کو مستقل بڑھاتے رہنا حکومت کی بنیادی ذمہ داری گردانتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے وہ سب لوگ سرمایہ داری پر ایمان لے آئے ہیں اور سرمایہ داری کا تو مقصد ہی فروغ لذات، شہوات اور آزادی کے علاوہ کچھ نہیں۔

یقیناً سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی ایسے بحرانوں سے دوچار ہے جن کا اس کے پاس کوئی حل موجود نہیں اور سرمایہ دارانہ عدل کے قیام کی جستجو عبث نظر آتی ہے۔ سوشل ڈیموکریٹ اور لبرل پالیسیوں میں فرق کرنا مشکل تر ہوتا جا رہا ہے اور سوشل ڈیموکریٹک حکومتیں عوام سے کیے ہوئے ویلفیئر کو فروغ دینے والے وعدوں سے بھی گریز کر رہی ہیں۔ عملاً آج پوری دنیا میں سرمایہ دارانہ عدل کے قیام کی جدوجہد معدوم ہوتی جا رہی ہے اور سرمایہ دارانہ مفکرین سرمایہ دارانہ عوام کو باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ سرمایہ دارانہ ظلم برداشت کرنا اس لیے ضروری ہے کہ سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کا کوئی متبادل موجود نہیں۔

سوشل ڈیموکریسی اور اسلام:

آج جب کہ مغرب سرمایہ دارانہ عدل کے قیام سے مایوس ہو گیا ہے دنیا بھر کی اسلامی جماعتیں سرمایہ دارانہ عدل کی وکیل بن کر سامنے آ رہی ہیں۔ سوشل ڈیموکریسی نے اسلامی سیاسی جماعتوں کو بے حد متاثر کیا۔ جماعتِ اسلامی کا حالیہ منشور اور اخوان المسلمون کا ۲۰۱۲ء کے انتخابات کا منشور سوشل ڈیموکریٹک تجزیوں اور پالیسیوں سے بھرا پڑا ہے۔ یہ جماعتیں حکومت الٰہیہ کو ویلفیئر اسٹیٹ تصور کرتی ہیں۔ ان کے منشوروں میں نفاذِ شریعت کا ذکر تو دبا ہوا ہے لیکن ہیومن اور سوشل رائٹس (Human and Social Rights) کی فراہمی کے دعوے نہایت بلند آہنگ ہیں۔ یہ قومی دستور کی تقدیس کی قائل ہیں اور ان کا تصورِ ریاست Locke اور Jeffer son سے ماخوذ ہے۔ ریاست کی جو ذمہ داریاں یہ تفویض کرتے ہیں ان کا امام ماوردی، امام ابویعلٰی امام ابن خلدون اور امام محمد رحمھم اللہ کی سیاسی تصنیفات میں کہیں ذکر نہیں ملتا۔ ریاست اسلامی کی جو خصوصیات اسلامی جماعتوں کے مفکرین بیان کرتے ہیں وہ چند احادیث اور آیات کی ایسی تشریح پر مبنی ہیں جو اصولِ تفسیر اور اصولِ تاویل الحدیث سے صرفِ نظر کر کے مرتب کی گئی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی حکومت سوشل ڈیموکریٹک ویلفیئر اسٹیٹ نہ کبھی رہی ہے نہ کبھی ہوگی نہ کبھی ہو سکتی ہے۔ کیوں کہ اسلام سرمایہ دارانہ عدل کے قیام کی جدوجہد نہیں سرمایہ دارانہ نظام زندگی کے انہدام کی جدوجہد ہے۔

اسلامی جماعتوں نے سوشل ڈیموکریٹک ایجنڈہ اپنا کر جو بنیادی غلطی کی ہے وہ یہ ہے کہ اس ایجنڈے کے تحت معاش کو حصول معاد کے ذریعہ کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ حصولِ معاش ایک مقصد کے طور پر پیش کیا جاتا ہے اور اس کو خود ایک مستقل مقاصد شریعت کے طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں ریاستی جدوجہد تعمیر معاشرت اور اصلاح انفرادیت کے عمل کا ذریعہ نہیں رہتی اور اسلامی جماعتیں سرمایہ دارانہ انفرادیت، معاشرت اور ریاستی صف بندی کے ارتباط سے صرف نظر کر لیتی ہیں۔ ایک ویلفیئر اسٹیٹ کے قیام کی جدوجہد ایک سرمایہ دارانہ معاشرت میں ڈوبا سرمایہ دارانہ فرد ہی کر سکتا ہے۔ اسلامی شخصیت سازی کا ویلفیئر اسٹیٹ کے قیام سے کوئی تعلق نہیں اور نہ اسلامی معاشرتی صف بندی سے اس کا کوئی تعلق ہے۔ اسلامی سیاسی تعلیمات اور سوشل ڈیموکریسی میں وہی تعلق ہے جو ایمان اور کفر، اور نور اور تاریکی اور حق اور باطل میں ہے۔ یہ ایک دوسرے کی رد ہیں۔

انارکزم کیا ہے؟

انارکزم ایک سرمایہ دارانہ نظریہ ہے جو انیسویں صدی کے اوائل میں ظہور پذیر ہوا اور آج پھر ایک تحریک اور ایک فکر کے طور پر اہمیت اختیار کر رہا ہے۔ اس طرزِ فکر کی ابتدا ایک انگریز Calvanist پادری نے کی جس کا نام William Godwin تھا، جو ۱۷۵۶ء سے ۱۸۳۶ء تک زندہ رہا۔ لیکن انگلستان میں یہ فکر کبھی مقبول نہ ہوسکی۔ Anarchism کے اہم ترین مفکرین فرانس اور روس میں پیدا ہوئے اور انیسویں اور بیسویں صدی کے اوائل میں ان دونوں ممالک اور اسپین میں انارکزم ایک طاقتور تحریک کے طور پر ابھری۔ دورِ حاضر میں یہ تحریک امریکا، یوکرین، میکسیکو، بولیویا اور چین میں پھل پھول رہی ہے۔ مسلم ممالک میں ایران اور تیونس اس تحریک سے خاصے متاثر نظر آتے ہیں۔

انیسویں صدی کے اکابر انارکسٹوں کے نام یہ ہیں:

Peirre Proudhon

Leo Tolstoy

Mikhail Bakunin

Prince Peter Kropotkin

Emma Goldman

دورِ حاضر میں جو نمایاں مفکرین انارکزم سے متاثر ہیں ان میں Chomsky, Nozick, Rand اور Wallerstein کے نام شامل ہیں۔ دورِ حاضر کی سب سے موثر انارکسٹ تحریک Zapatista کہلاتی ہے اور اس کا قائد Sub Commandant Marcos ہے۔ یہ تحریک Mexico میں طاقتور ہے اور اس ہی تحریک کے متاثرین نے ہمسایہ ریاست Nicaragua میں امریکی فوج کا ساتھ دے کر استعمار مخالف تحریک Sandanista کو شکست دی۔

انارکزم کے بنیادی تصورات:

انارکسٹ تحریک سرمایہ دارانہ عدل کے حصول کی جدوجہد کرنے والی تحریک ہے۔ سرمایہ دارانہ عدل یہ ہے کہ ہر شخص اس بات کا مکلّف ہو کہ وہ خیر و شر کی جو تعریف کرنا چاہے وہ کرنے میں اس معنی میں آزاد ہو کہ کوئی دوسرا شخص یا گروہ اس کو خیر اور شر کی کسی اور تعبیر کو قبول کرنے پر مجبور نہ کر سکے۔ اس کو خود تخلیقیت (Autonomy) کہتے ہیں۔ انارکسٹ سمجھتے ہیں کہ ریاست خود تخلیقیت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے اور ریاست کو ختم کئے بغیر خود تخلیقیت اور مساویانہ آزادی (Equal freedom) کو فروغ دینا ناممکن ہے۔ سرمایہ دارانہ انفرادیت اور سرمایہ دارانہ معیشت کو فروغ دینے کے لیے کسی نظامِ اقتدار (یعنی ریاست) کی کوئی ضرورت نہیں۔ انارکسٹ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ خود تخلیقیت کو بروئے کار لانے کے لیے خود حاکمیت (Self Government) لازماً ناگزیر ہے۔ انسان کو صرف اپنے نفس کا بندہ ہونا چاہیے اور کسی بیرونی قوت کے اقتدار کو قبول نہیں کرنا چاہیے۔ انارکزم جمہوریت کا خالص ترین ڈھانچہ (Purest Form) ہے کیوں کہ جمہوریت نفس پرستی کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

انارکسٹ ان تمام معاشرتی اداروں کے بھی مخالف ہیں جو نفس پرستی کی تحدید کرتے ہیں۔ بیشتر انارکسٹ ملحد کافر ہوتے ہیں، کیوں کہ ان کی رائے میں خدا اور مذہب نفس پرستی کو رد کرتے ہیں کچھ انارکسٹوں مثلاً Tolstoy اور کسی حد تک Kirkegard نے عیسائیت کی نفس پرستانہ تعبیر بھی پیش کی ہے اور بیسویں صدی کے ایرانی مفکر علی شریعتی نے ان مفکرین کی پیروی کرتے ہوئے الوھیت الناس کا تصور پیش کیا ہے (لیکن شریعتی انارکسٹ نہ تھے ان کی فکر اشترا کی اور اسلامی تصورات کا ایک ملغوبہ تھی) علامہ اقبال کے تصورِ خودی میں بھی الوھیت الناس کی جھلکیاں ملتی ہیں۔

انارکسٹ خاندان کے بھی شدید مخالف ہیں۔ انارکسٹ عوامی تحریکیں گھناؤنی ترین جنسی بے راہ روی کی تبلیغ کرتی ہیں۔ سب سے مشہور انارکسٹ جس نے جنسی بے راہ روی کے فروغ کے لیے اپنی زندگی وقف کی امریکی Emma Goldman تھی۔ انارکسٹ اسکول کے ادارہ کی بھی مخالفت کرتے ہیں کیوں کہ اسکول اقتدار کی اطاعت کی عادت ڈالتے ہیں۔

نظامِ اقتدار کو تتر بتر کرنے کے لیے انارکسٹوں کا ایک مکتب تشدد کو لازم تصور کرتا ہے۔ یہ متشدد انارکسٹ روس میں نمایاں ہوئے ان میں Bakunin, Kropotkin اور Sergy Nachyev شامل ہیں۔ یہ تینوں کٹر ملحد تھے اور پادریوں کے قتلِ عام پر خاص زور دیتے تھے۔ Nacheyev کی اسلام دشمنی بھی مشہور ہے۔ Bakunin کے خیال میں انقلاب برپا کرنے والی اصل قوت شہروں کی کچی آبادی کے مسلح افراد (Lumpen Proletariat) فراہم کرتے ہیں۔ Bakunin کسانوں کی عسکری اور معاشی صف بندی پر بھی زور دیتا تھا۔ Bakunin روس کی سب سے اہم انارکسٹ تحریک Norodnik سے متاثر تھا۔ یہ تحریک Nihilism کا پرچار کرتی تھی۔ Nihil ism کو خالص منفیت کہتے ہیں۔ Nihilism تحریک کا پورا زور افراد اور اداروں کو برباد کرنے پر ہوتا ہے۔ ان کی رائے میں سرمایہ دارانہ عدل کے قیام کے لیے ضروری ہے کہ سرمایہ دارانہ ظلم کرنے والی ریاستی اور کاروباری قیادت کو قتل کر دیا جائے اور اس عمل کے نتیجہ میں سرمایہ دارانہ عادلانہ انقلاب برپا ہوگا۔ Norodnik تحریک کا سب سے مشہور راہنما Bakunin کا شاگرد Nacheyev تھا۔ Nacheyev کے شاگردوں نے روس کی Social Revolutionary Party پر قبضہ کر کے 1917ء میں زار کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور گو کہ Lenin نے Social Revolutionary party کی حکومت کے خلاف مسلح بغاوت کی لیکن Nacheyev کی فکر سے شدید متاثر تھا۔ Nacheyev کو 1884ء میں پھانسی دے دی گئی تھی۔

انارکسٹوں کا دوسرا مکتب فکر تشدد کی تردید کرتا ہے۔ اس مکتبِ فکر کا اہم ترین مفکر Prodhoun ہے۔ وہ ذاتی ملکیت کو چوری (Property is Theft) کہتا تھا اور مارکس کی Labour Theory of value کا قائل تھا۔ (اس نظریہ کے مطابق کسی شے کی قدر صرف اس سے متعین ہوتی ہے کہ اس شے کی پیدوار میں کتنی محنت صرف ہوئی ہے) وہ حکومت کے خاتمے اور مزدوروں کی رضا کارانہ معاشرتی تنظیموں کے قیام کو ضروری سمجھتا تھا۔ Prodhoun کی رائے میں یہ تنظیمیں (Syndicates) معاشرہ کی خود حکومتی (Self government) تنظیم ممکن بنائیں گی اور ان کی خود حاکمیت کے نتیجہ میں کسی سیاسی نظامِ اقتدار کے موجود رہنے کی ضرورت نہ رہے گی۔

Prodhoun سرمایہ دارانہ عدل کے قیام کے لیے کسی پرتشدد انقلاب کا قائل نہ تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اگر مزدور Syndicates میں منظّم ہوگئے تو سیاسی اقتدار خود بخود ان کے ہاتھوں میں آجائے گا اور سرمایہ دارانہ ریاستی نظام منتشر (Collapse) ہو جائے گا۔

Prodhoun کی فکر نے یورپی مزدوروں کی تحریک (trade union movement) کو بہت متاثر کیا ہے اور سوشل ڈیموکریٹک جماعتیں (مثلاً فرانس کی PSF برطانیہ کی Labour Party اور جرمنی کی SPD) مزدوروں کی پرامن جمہوری تنظیم کے ذریعہ ہی سرمایہ دارانہ نظامِ ریاست میں اقتدار پر قبضہ کی کوشش کرتی ہیں۔ خود روس کی کیمونسٹ پارٹی کا ایک دھڑا (جس کو Memshevik کہتے ہیں) عدم تشدد اور مزدوروں کی جمہوری تنظیم کے ذریعہ انقلاب برپا کرنے کی حکمتِ عملی کا قائل تھا۔ گاندھی بھی عدم تشدد کے فلسفہ کا داعی تھا۔ وہ اپنے آپ کو Tolstoy کا شاگرد کہتا تھا اور گاندھی کے مجوزہ ''پنچائیتی نظام'' میں Syndicatist فکر کی بہت سی جھلکیاں دیکھی جا سکتی ہیں۔

دورِ حاضر کی انارکسٹ تحریکیں

۱۹۶۰ء کی دہائی میں انارکسٹ تحریک کا احیاء یورپ اور امریکا میں ہوا۔ اس کا بنیادی محرک جنسی بے راہ روی کا وہ سیلاب تھا جو یورپ اور امریکا میں اس دہائی میں رونما ہونا شروع ہوا جس نے ان ممالک میں خاندانی نظام کو تقریباً بالکل برباد کر دیا ہے۔

اس جنسی بے راہ روی کے فروغ کا گہرا تعلق اس معاشی حکمتِ عملی سے بھی ہے، جس کو Neo Liberalism کہتے ہیں اور جو ۱۹۷۱ء کے بعد امریکا اور بیشتر یورپی ممالک میں غالب رہی اس کو ''انفرادی انارکزم'' (Individualist Anarkism) بھی کہتے ہیں اور اس کا بانی امریکی انارکسٹ Max Stemn ہے۔ اس کا فلسفہ یہ ہے کہ لوگوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے جو چاہیں کریں۔ خواہشات کی تحدید کا معاشرہ کو کوئی حق نہیں۔ Ayn Rand کہتی ہے کہ خود غرضی سب سے اعلیٰ انسانی وصف ہے۔ Nozick ایک ایسی ریاست کی توجیہہ بیان کرتا ہے جو ارتکازِ قوت کے عمل میں قطعاً حائل نہ ہو۔

جنسی اور معاشرتی بے راہ روی کی یہ دونوں گمراہیاں جن تحریکات میں سموئی گئی ہیں ان کو New Social Movements کہتے ہیں اور ان کی عالمی تنظیم World Social Forum (WSF) ہے جو سال میں ایک بار فواحش اور فسق و فجور کا ایک عالمی میلہ لگاتا ہے۔ چیدہ چیدہ New Social Movement حسب ذیل ہیں:

☆......تحریکِ نسواں (Feminist Movement)

☆......ماحولیاتی تحریک (Enoronmental Movement)

☆......اغلام بازوں کی تحریک (Homo Lesbian Movement)

☆......ردِّ عالمگیریت کی تحریک (Antiglobalization Movement)

☆......حقوقِ انسانی کی تحریک (Movement for Human Rights)

☆......نیوکلیر مخالف تحریک (Anti Nuclear Movement)

☆......امن کی تحریک (Anti War Movement)

ان تحریکوں کی مشترکہ بنیادی خصوصیات حسبِ ذیل ہیں:

۱......یہ سب تحریکیں آزادی کو فروغ دینا اپنا اصل مقصد قرار دیتی ہیں۔ یہ سب سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کو فروغ دینے والی تحریکیں ہیں۔ یہ سب حرص اور ہوس کو عام کرنے والی اور عبادت کو رد کرنے والی تحریکیں ہیں۔ یہ جو ماحول قائم کرتی ہیں اور جس میں یہ فروغ پاتی ہیں وہ نہایت غلیظ، پراگندہ اور شہوانی جذبات سے لبریز ماحول ہوتا ہے۔ اس ماحول میں عصمت اور شرافت کی دھجیاں اڑادی جاتی ہیں۔ ان تحریکوں میں حصہ لینا شیطان کی پوجا کے مترادف ہے۔

۲......یہ سب حقوق کی تحریکیں ہیں اور خود غرضی اور مطلب پرستی کو فروغ دیتی ہیں۔ یہ فرد کو خود حاکمیت اور خود تخلیقیت (Automory) کا درس دیتی ہیں۔ یہ انسان کو اپنے نفس کا بندہ بنادیتی ہیں اور ان تحریکوں میں شامل ہو کر انسان اپنے نفس کو حرص اور ہوس کے شیطانوں کے سپرد کر دیتا ہے۔

۳......یہ خاندانی نظام اور تہذیبی روایات کو بھسم کرنے والی تحریکیں ہیں۔ ان کا شناختی رنگ خالصتاً شیطانی ہے۔ ان کی صدا موسیقی اور ان کا فعل رقص ہے۔

۴......یہ سب یک جہتی تحریکیں ہیں۔ یہ سرمایہ دارانہ نظام کی کسی ایک کمزوری کو دور کرنے کی جدوجہد کرتی ہیں تاکہ سرمایہ دارانہ عمل مستحکم ہو مثلاً ردِ عالمگیریت (Anti Globalisation) تحریک دراصل صرف ذیلی عالمگیریت (Globalisation From Below) کی تحریک ہے۔ اس کا مقصد سرمایہ دارانہ وسائل اور حقوق کی عام آدمی تک رسائی کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ یہ سرمایہ دارانہ نظام کی تقسیمی ناہمواریاں (Distributional Imbalance) کو دور کرنے کی جدوجہد کے علاوہ اور کچھ نہیں اور سرمایہ دارانہ سرخیل اس بات سے خوب واقف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ردِ عالمگیریت کو فنڈ دینے والی عالمی سرمایہ دارانہ کمپنیاں ہیں، اور ان ہی کمپنیوں کے پیسوں سے ہر سال ورلڈ سوشل فورم کا میلہ سجایا جاتا ہے۔ ورلڈ بینک، آئی ایم ایف اور Trade Organization World ردِ عالمگیریت کی تحریکوں سے مسلسل مشاورت کے عمل کو جاری رکھتے ہیں۔

۵......نیو سوشل مومنٹس (Neo Social Movements) استعمار بالخصوص امریکی استعمار کی کاسہ لیس تنظیمیں ہیں نگاراگوا (Nicaragua) کی جنگ میں امریکی فوج نے Zapista کی تنظیم کو Sandinista گوریلوں کو شکست دینے کے لیے استعمال کیا افغانستان، ایران، صومالیہ، عراق، جنوبی سوڈان اور مالی میں یہ New Social Movements امریکا اور World Bank کے مخبروں کا کام دیتی ہیں اور چند ماہ قبل (جولائی 2012ء) میں وینزویلا (Venezuela) میں تحریکِ نسواں کا ایک ایسا Network پکڑا گیا جو چھ سال سے سی آئی اے کو حکومتِ وینزویلا کی خفیہ اطلاعات فراہم کرتا رہا ہے۔

۶......یہ ریاست کو کمزور کرنے والی تحریکیں ہیں۔ یہ ایک ایسے قوت کے Network کو قائم کرتی ہیں جو ملکی اقتدار حکومت سے چھین لیتا ہے اور اس اقتدار کو بین الاقوامی سرمایہ دارانہ اداروں کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ Karry Logar بل کے تحت پاکستان کو جو امداد فراہم کی گئی ہے وہ ان ہی New Social Movements کی NGO Network نے استعمال کی ہے۔

۷......ان New Social Movements کا ایک اہم مقصد مسلمان ممالک کے ریاستی نظام کو کمزور کرنا ہے۔ وہ اس کے ذریعہ مسلم ممالک پر امریکی حکمرانی کو قائم کرنا چاہتی ہیں۔ اس کی سب سے واضح مثال Zapitista کی تحریک ہے۔ یہ تحریک دو تین دہائیوں تک Mexico کے قدیم باشندوں (Red Indians) کو سیاسی اور سماجی طور پر متحرک (mobilize) کرتی رہی اور 1990 کی دہائی کے اوائل تک ایک عظیم عوامی تحریک کی شکل اختیار کر گئی۔ اس کی قیادت میں لاکھوں افراد نے دارالحکومت (Mexico City) پر قبضہ کر لیا، لیکن اس تحریک نے حکومت وقت کو معطل نہ کیا کوئی نئی حکومت قائم نہ کی بلکہ صرف ایسے مطالبات منوائے جن سے Mexico کا ریاستی نظام مفلوج ہو کر امریکا کا کلیتاً محتاج ہو کر رہ گیا اور اب Zapista کی تحریک Mexico میں امریکی حکومت کے مفادات کے تحفظ کا کام انجام دے رہی ہے اور عالمی سرمایہ دارانہ نظام میں Mexico پوری طرح ضم ہو کر رہ گیا ہے۔

تحریکاتِ اسلامی اور دورِ حاضر کی انارکسٹ تحریکیں:

چوں کہ دورِ حاضر کی انارکسٹ تحریکیں، تحریکِ نسواں، ماحولیاتی تحریک، عالمی امن کی تحریک Anti Nuclear and Peace Movements, اغلام بازوں کی تحریک وغیرہ، آزادی کو فروغ دینے کی تحریکیں ہیں لہٰذا وہ لازماً عالمی سرمایہ دارانہ نظام کو مستحکم کرنے والی تحریکیں ہیں۔ یہ سب اسلام دشمن تحریکیں ہیں کیوں کہ اسلام بندگی اور عبودیت کی بنیاد پر اپنا نظامِ زندگی استوار کرنا چاہتا ہے۔ ہمیں ان تمام تحریکوں کی بھرپور اصولی اور عملی مخالفت کرنی چاہیے۔

دورِ حاضر میں یہ انارکسٹ تحریکیں عرب دنیا میں ایک بڑے خطرہ کے طور پر ابھر کر سامنے آئی ہیں۔ تیونس مراکش، لیبیا اور مصر میں 2011ء سے آنے والی عوامی تحریکات حصولِ آزادی کی تحریکات ہیں اور New Social Movements کے بہت سے مطالبات کو ان تحریکات نے اپنا لیا ہے۔ عرب بہار (Arab Spring) کا معاشرتی اظہار اسلامی نہیں، اس کا سب سے اہم ثبوت تحریر اسکوائر (Tahrir Square) میں بروئے کار آنے والی معاشرت ہے جہاں ہم اسلامی فضا قائم کرنے میں ناکام رہے اور فسق و فجور کے طوفان بدتمیزی کا سیلاب شرع کی بیشتر حدود کو پامال کر گیا۔

اخوان المسلمون نے کسی عرب ملک میں آزادی کو بحیثیت ہدف رد نہیں کیا۔ ان ممالک میں رائج شدہ سرمایہ دارانہ نظام میں اب تک کسی ہیئتی تبدیلی کی کوئی نشانی نہیں ملتی۔ امریکا اور اسرائیل کے خلاف ہم ابھی تک کوئی موثر اقدام نہیں کر سکے۔ ابھی تک ہماری تمام توقعات پارلیمانی دستوری نظام میں شمولیت سے ظاہراً وابستہ نظر آتی ہیں۔

میرا گمان ہے کہ اخوان یہ رویہ اختیار کرنے پر مجبور ہے، راضی نہیں ہے۔ اخوان کا ایک عام کارکن اور اس کی قیادت اسلام کے مخلص ترین شیدائیوں پر مشتمل

ہے۔اخوان اللہ پر، رسولوں پر اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ وہ آزادی و مساوات اور ترقی پر کیسے ایمان لا سکتے ہیں۔ جمہوری دستوری نظام سرمایہ دارانہ نظام زندگی کو مسخر کرنے کے جو مواقع فراہم کرتا ہے اخوان اس سے فائدہ اٹھانے کی پوری صلاحیت اور عزم رکھتے ہیں۔ جمہوری دستوری نظام پر انحصار کی مجبوری کو کم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اخوان کی قیادت:

۱......ترکی کی جسٹس اینڈ ڈویلپمنٹ پارٹی کے نظریات اور حکمتِ عملی کو صریحاً رد کرے۔

۲......معاشرہ میں آزادی، مساوات اور ترقی کے کفریہ نظریات ہونے کا شعور بتدریج پیدا کرے اور اسلامی روحانیت سے مصری انفرادیت اور معاشرت کو سرشار کردے۔ اپنے دورِ ابتلا میں حاصل کردہ تجربات سے فائدہ اٹھا کر اخوان یہ کام بحسن و خوبی انجام دینے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔

۳...... نیوسوشل موومنٹس کو استعمار اور اسرائیل کی ایجنٹ تنظیموں کے طور پر عوام میں مشتہر کرے اور عوامی حقوق کے حصول کی تمام تحریکات کو De-legitimise کرے۔ حقوق کے حصول کی تحریکوں سے کسی سطح پر اشتراکِ عمل کو روا نہ رکھے۔ بلکہ ان تحریکات کے قائدین کو مصری ریاست کے غدار اور اسرائیل اور امریکا کے کاسہ لیس ایجنٹوں کے طور پر عوام میں مشتہر کرے اور فواحش اور منکرات پھیلانے والے شیطانی ٹولوں کے طور پر متعارف کرائے۔

۴......اسلامی نظام اقتدار کو استوار کرنے کے لیے مساجد و مدارس کو بنیاد بنا کر ریاست کی ترتیب نو کی داغ بیل ڈالے اور ایک مربوط اور ہمہ جہت حکمتِ عملی کے تحت ریاستی اداروں، فوج، پولیس سول انتظامیہ، عدلیہ، میڈیا اور تعلیمی اداروں کو مساجد اور مدارس کے زیر تسلط لے آئے۔

۵......سرمایہ دارانہ ریاستی نظام کی تحلیل اور اسلامی نظامِ اقتدار کی ترتیب نَو کے عمل سے داخلی اور خارجی ریاستی پالیسیوں میں تبدیلی کے عمل کو مربوط کردے۔

مصر میں (اور شاید کچھ دیگر عرب ممالک میں بھی) ایک اسلامی گروہ کی حکومت قائم ہے۔ اس اسلامی گروہ کی حکومت کی بقا کا انحصار سب سے زیادہ اس بات پر ہے کہ یہ اسلامی حکومت، ایک اسلامی ریاست (یعنی اسلامی نظام اقتدار) قائم کرنے میں کامیاب ہوتی ہے یا نہیں۔ اگر ہم نے اسلامی ریاست کے قیام کی ضرورت اور اولیت سے انکار کیا اور سرمایہ دارانہ ریاستی نظام کی اسلام کاری پر اکتفا کیا تو ہمارا حشر جسٹس اینڈ ڈویلپمنٹ پارٹی جیسا ہوگا جس کو آج اوباما Nato's Islamist کہتا ہے۔

انارکزم کیا ہے؟

انارکزم ایک سرمایہ دارانہ نظریہ ہے جو انیسویں صدی کے اوائل میں ظہور پذیر ہوا اور آج پھر ایک تحریک اور ایک فکر کے طور پر اہمیت اختیار کر رہا ہے۔ اس طرزِ فکر کی ابتدا ایک انگریز Calvanist پادری نے کی جس کا نام William Godwin تھا، جو ۱۷۵۶ء سے ۱۸۳۶ء تک زندہ رہا۔ لیکن انگلستان میں یہ فکر کبھی مقبول نہ ہوسکی۔ Anarchism کے اہم ترین مفکرین فرانس اور روس میں پیدا ہوئے اور انیسویں اور بیسویں صدی کے اوائل میں ان دونوں ممالک اور اسپین میں انارکزم ایک طاقتور تحریک کے طور پر ابھری۔ دورِ حاضر میں یہ تحریک امریکا، یوکرین، میکسیکو، بولیویا اور چین میں پھل پھول رہی ہے۔ مسلم ممالک میں ایران اور تیونس اس تحریک سے خاصے متاثر نظر آتے ہیں۔

انیسویں صدی کے اکابر انارکسٹوں کے نام یہ ہیں:

Peirre Proudhon

Leo Tolstoy

Mikhail Bakunin

Prince Peter Kropotkin

Emma Goldman

دورِ حاضر میں جو نمایاں مفکرین انارکزم سے متاثر ہیں ان میں Chomsky, Nozick, Rand اور Wallerstein کے نام شامل ہیں۔ دورِ حاضر کی سب سے موثر انارکسٹ تحریک Zapatista کہلاتی ہے اور اس کا قائد Sub Commandant Marcos ہے۔ یہ تحریک Mexico میں طاقتور ہے اور اس ہی تحریک کے متاثرین نے ہمسایہ ریاست Nicaragua میں امریکی فوج کا ساتھ دے کر استعمار مخالف تحریک Sandanista کو شکست دی۔

انارکزم کے بنیادی تصورات:

انارکسٹ تحریک سرمایہ دارانہ عدل کے حصول کی جدوجہد کرنے والی تحریک ہے۔ سرمایہ دارانہ عدل یہ ہے کہ ہر شخص اس بات کا مکلّف ہو کہ وہ خیر و شر کی جو تعریف کرنا چاہے وہ کرنے میں اس معنی میں آزاد ہو کہ کوئی دوسرا شخص یا گروہ اس کو خیر اور شر کی کسی اور تعبیر کو قبول کرنے پر مجبور نہ کرسکے۔ اس کو خود تخلیقیت (Autonomy) کہتے ہیں۔ انارکسٹ سمجھتے ہیں کہ ریاست خود تخلیقیت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے اور ریاست کو ختم کیے بغیر خود تخلیقیت اور مساویانہ آزادی (Equal freedom) کو فروغ دینا ناممکن ہے۔ سرمایہ دارانہ انفرادیت اور سرمایہ دارانہ معیشت کو فروغ دینے کے لیے کسی نظامِ اقتدار (یعنی ریاست) کی کوئی ضرورت نہیں۔ انارکسٹ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ خود تخلیقیت کو بروئے کار لانے کے لیے خود حاکمیت (Self Government) لازماً ناگزیر ہے۔ انسان کو صرف اپنے نفس کا بندہ ہونا چاہیے اور کسی بیرونی قوت کے اقتدار کو قبول نہیں کرنا چاہیے۔ انارکزم جمہوریت کا خالص ترین ڈھانچہ (Purest Form) ہے کیوں کہ جمہوریت نفس پرستی کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

انارکسٹ ان تمام معاشرتی اداروں کے بھی مخالف ہیں جو نفس پرستی کی تحدید کرتے ہیں۔ بیشتر انارکسٹ ملحد کافر ہوتے ہیں، کیوں کہ ان کی رائے میں خدا اور

مذہب نفس پرستی کو رد کرتے ہیں کچھ انارکسٹوں مثلاً Tolstoy اور کسی حد تک Kirkegard نے عیسائیت کی نفس پرستانہ تعبیر بھی پیش کی ہے اور بیسویں صدی کے ایرانی مفکر علی شریعتی نے ان مفکرین کی پیروی کرتے ہوئے الوهيت الناس کا تصور پیش کیا ہے (لیکن شریعتی انارکسٹ نہ تھے ان کی فکر اشتراکی اور اسلامی تصورات کا ایک ملغوبہ تھی) علامہ اقبال کے تصورِ خودی میں بھی الوهيت الناس کی جھلکیاں ملتی ہیں۔

انارکسٹ خاندان کے بھی شدید مخالف ہیں۔ انارکسٹ عوامی تحریکیں گھناؤنی ترین جنسی بے راہ روی کی تبلیغ کرتی ہیں۔ سب سے مشہور انارکسٹ جس نے جنسی بے راہ روی کے فروغ کے لیے اپنی زندگی وقف کی امریکی Emma Goldman تھی۔ انارکسٹ اسکول کے ادارہ کی بھی مخالفت کرتے ہیں کیوں کہ اسکول اقتدار کی اطاعت کی عادت ڈالتے ہیں۔

نظامِ اقتدار کو تتر بتر کرنے کے لیے انارکسسٹوں کا ایک مکتب تشدد کو لازم تصور کرتا ہے۔ یہ متشدد انارکسٹ روس میں نمایاں ہوئے ان میں Bakunin, Kropotkin اور Sergy Nachyev شامل ہیں۔ یہ تینوں کٹر ملحد تھے اور پادریوں کے قتل عام پر خاص زور دیتے تھے۔ Nacheyev کی اسلام دشمنی بھی مشہور ہے۔ Bakunin کے خیال میں انقلاب برپا کرنے والی اصل قوت شہروں کی کچی آبادی کے مسلح افراد (Lumpen Proletariat) فراہم کرتے ہیں۔ Bakunin کسانوں کی عسکری اور معاشی صف بندی پر بھی زور دیتا تھا۔ Bakunin روس کی سب سے اہم انارکسٹ تحریک Norodnik سے متاثر تھا۔ یہ تحریک Nihilism کا پرچار کرتی تھی۔ Nihil ism کو خالص منفیت کہتے ہیں۔ Nihilism تحریک کا پورا زور افراد اور اداروں کو برباد کرنے پر ہوتا ہے۔ ان کی رائے میں سرمایہ دارانہ عدل کے قیام کے لیے ضروری ہے کہ سرمایہ دارانہ ظلم کرنے والی ریاستی اور کاروباری قیادت کو قتل کر دیا جائے اور اس عمل کے نتیجہ میں سرمایہ دارانہ عادلانہ انقلاب برپا ہوگا۔ Norodnik تحریک کا سب سے مشہور راہنما Bakunin کا شاگرد Nacheyev تھا۔ Nacheyev کے شاگردوں نے روس کی Social Revolutionary Party پر قبضہ کر کے 1917ء میں زار کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور گو کہ Lenin نے Social Revolutionary party کی حکومت کے خلاف مسلح بغاوت کی لیکن Nacheyev کی فکر سے شدید متاثر تھا۔ Nacheyev کو 1884ء میں پھانسی دے دی گئی تھی۔

انارکسٹوں کا دوسرا مکتب فکر تشدد کی تردید کرتا ہے۔ اس مکتب فکر کا اہم ترین مفکر Prodhoun ہے۔ وہ ذاتی ملکیت کو چوری (Property is Theft) کہتا تھا اور مارکس کی Labour Theory of value کا قائل تھا۔ (اس نظریہ کے مطابق کسی شے کی قدر صرف اس سے متعین ہوتی ہے کہ اس شے کی پیداوار میں کتنی محنت صرف ہوئی ہے) وہ حکومت کے خاتمے اور مزدوروں کی رضا کارانہ معاشرتی تنظیموں کے قیام کو ضروری سمجھتا تھا۔ Prodhoun کی رائے میں یہ تنظیمیں (Syndicates) معاشرہ کی خود حکومتی (Self government) تنظیم ممکن بنائیں گی اور ان کی خود حاکمیت کے نتیجہ میں کسی سیاسی نظامِ اقتدار کے موجود رہنے کی ضرورت نہ رہے گی۔

Prodhoun سرمایہ دارانہ عدل کے قیام کے لیے کسی پر تشدد انقلاب کا قائل نہ تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اگر مزدور Syndicates میں منظم ہو گئے تو سیاسی اقتدار خود بخود ان کے ہاتھوں میں آ جائے گا اور سرمایہ دارانہ ریاستی نظام منتشر (Collapse) ہو جائے گا۔

Prodhoun کی فکر نے یورپی مزدوروں کی تحریک (trade union movement) کو بہت متاثر کیا ہے اور سوشل ڈیموکریٹک جماعتیں (مثلاً فرانس کی PSF برطانیہ کی Labour Party اور جرمنی کی SPD) مزدوروں کی پرامن جمہوری تنظیم کے ذریعہ ہی سرمایہ دارانہ نظامِ ریاست میں اقتدار پر قبضہ کی کوشش کرتی ہیں۔ خود روس کی کمیونسٹ پارٹی کا ایک دھڑا (جس کو Memshevik کہتے ہیں) عدم تشدد اور مزدوروں کی جمہوری تنظیم کے ذریعہ انقلاب برپا کرنے کی حکمتِ عملی کا قائل تھا۔ گاندھی بھی عدم تشدد کے فلسفہ کا داعی تھا۔ وہ اپنے آپ کو Tolstoy کا شاگرد کہتا تھا اور گاندھی کے مجوزہ "پنچائیتی نظام" میں Syndicatist فکر کی بہت سی جھلکیاں دیکھی جا سکتی ہیں۔

دورِ حاضر کی انارکسٹ تحریکیں

۱۹۶۰ء کی دہائی میں انارکسٹ تحریک کا احیاء یورپ اور امریکا میں ہوا۔ اس کا بنیادی محرک جنسی بے راہ روی کا وہ سیلاب تھا جو یورپ اور امریکا میں اس دہائی میں رونما ہونا شروع ہوا جس نے ان ممالک میں خاندانی نظام کو تقریباً بالکل برباد کر دیا ہے۔

اس جنسی بے راہ روی کے فروغ کا گہرا تعلق اس معاشی حکمتِ عملی سے بھی ہے، جس کو Neo Liberalism کہتے ہیں اور جو ۱۹۷۱ء کے بعد امریکا اور بیشتر یورپی ممالک میں غالب رہی اس کو "انفرادی انارکزم" (Individualist Anarkism) بھی کہتے ہیں اور اس کا بانی امریکی انارکسٹ Max Stemn ہے۔ اس کا فلسفہ یہ ہے کہ لوگوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے جو چاہیں کریں۔ خواہشات کی تحدید کا معاشرہ کو کوئی حق نہیں۔ Ayn Rand کہتی ہے کہ خود غرضی سب سے اعلیٰ انسانی وصف ہے۔ Nozick ایک ایسی ریاست کی توجیہہ بیان کرتا ہے جو ارتکازِ قوت کے عمل میں قطعاً حائل نہ ہو۔

جنسی اور معاشرتی بے راہ روی کی یہ دونوں گمراہیاں جن تحریکات میں سموئی گئی ہیں ان کو New Social Movements کہتے ہیں اور ان کی عالمی تنظیم World Social Forum (WSF) ہے جو سال میں ایک بار فواحش اور فسق و فجور کا ایک عالمی میلہ لگاتا ہے۔ چیدہ چیدہ New Social Movement حسب ذیل ہیں:

☆......تحریکِ نسواں (Feminist Movement)

☆......ماحولیاتی تحریک (Enoronmental Movement)

☆......اغلام بازوں کی تحریک (Homo Lesbian Movement)

☆......ردِّ عالمگیریت کی تحریک (Antiglobalization Movement)

☆......حقوقِ انسانی کی تحریک (Movement for Human Rights)

☆......نیوکلیر مخالف تحریک (Anti Nuclear Movement)

☆......امن کی تحریک (Anti War Movement)

ان تحریکوں کی مشترکہ بنیادی خصوصیات حسبِ ذیل ہیں:

۱...... یہ سب تحریکیں آزادی کو فروغ دینا اپنا اصل مقصد قرار دیتی ہیں۔ یہ سب سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کو فروغ دینے والی تحریکیں ہیں۔ یہ سب حرص اور ہوس کو عام کرنے والی اور عبادت کو رد کرنے والی تحریکیں ہیں۔ یہ جو ماحول قائم کرتی ہیں اور جس میں یہ فروغ پاتی ہیں وہ نہایت غلیظ، پراگندہ اور شہوانی جذبات سے لبریز ماحول ہوتا ہے۔ اس ماحول میں عصمت اور شرافت کی دھجیاں اڑا دی جاتی ہیں۔ ان تحریکوں میں حصہ لینا شیطان کی پوجا کے مترادف ہے۔

۲...... یہ سب حقوق کی تحریکیں ہیں اور خود غرضی اور مطلب پرستی کو فروغ دیتی ہیں۔ یہ فرد کو خود حاکمیت اور خود تخلیقیت (Automory) کا درس دیتی ہیں۔ یہ انسان کو اپنے نفس کا بندہ بنا دیتی ہیں اور ان تحریکوں میں شامل ہو کر انسان اپنے نفس کو حرص اور ہوس کے شیطانوں کے سپرد کر دیتا ہے۔

۳...... یہ خاندانی نظام اور تہذیبی روایات کو بھسم کرنے والی تحریکیں ہیں۔ ان کا شناختی رنگ خالصتاً شیطانی ہے۔ ان کی صدا موسیقی اور ان کا فعل رقص ہے۔

۴...... یہ سب یک جہتی تحریکیں ہیں۔ یہ سرمایہ دارانہ نظام کی کسی ایک کمزوری کو دور کرنے کی جدوجہد کرتی ہیں تاکہ سرمایہ دارانہ عمل مستحکم ہو مثلاً ردِ عالمگیریت (Anti Globalisation) تحریک دراصل صرف ذیلی عالمگیریت (Globalisation From Below) کی تحریک ہے۔ اس کا مقصد سرمایہ دارانہ وسائل اور حقوق کی عام آدمی تک رسائی کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ یہ سرمایہ دارانہ نظام کی تقسیمی ناہمواریاں (Distributional Imbalance) کو

دور کرنے کی جدوجہد کے علاوہ اور کچھ نہیں اور سرمایہ دارانہ سرخیل اس بات سے خوب واقف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ردِ عالمگیریت کو فنڈ دینے والی عالمی سرمایہ دارانہ کمپنیاں ہیں، اور ان ہی کمپنیوں کے پیسوں سے ہر سال ورلڈ سوشل فورم کا میلہ سجایا جاتا ہے۔ ورلڈ بینک ، آئی ایم ایف اور Trade Organization World ردِ عالمگیریت کی تحریکوں سے مسلسل مشاورت کے عمل کو جاری رکھتے ہیں۔

۵...... نیوسوشل مومنٹس(Neo Social Movements) استعمار بالخصوص امریکی استعمار کی کاسہ لیس تنظیمیں ہیں نگاراگوا(Nicaragua) کی جنگ میں امریکی فوج نے Zapista کی تنظیم کو Sandinista گوریلوں کو شکست دینے کے لیے استعمال کیا افغانستان، ایران، صومالیہ، عراق، جنوبی سوڈان اور مالی میں یہ New Social Movements امریکا اور World Bank کے مخبروں کا کام دیتی ہیں اور چند ماہ قبل (جولائی 2012ء) میں وینزویلا (Venezuela) میں تحریکِ نسواں کا ایک ایسا Network پکڑا گیا جو چھ سال سے سی آئی اے کو حکومتِ وینزویلا کی خفیہ اطلاعات فراہم کرتا رہا ہے۔

۶...... یہ ریاست کو کمزور کرنے والی تحریکیں ہیں۔ یہ ایک ایسے قوت کے Network کو قائم کرتی ہیں جو ملکی اقتدار حکومت سے چھین لیتا ہے اور اس اقتدار کو بین الاقوامی سرمایہ دارانہ اداروں کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ Karry Logar بل کے تحت پاکستان کو جو امداد فراہم کی گئی ہے وہ ان ہی New Social Movements کی NGO Network نے استعمال کی ہے۔

۷......ان New Social Movements کا ایک اہم مقصد مسلمان ممالک کے ریاستی نظام کو کمزور کرنا ہے۔ وہ اس کے ذریعہ مسلم ممالک پر امریکی حکمرانی کو قائم کرنا چاہتی ہیں۔ اس کی سب سے واضح مثال Zapitista کی تحریک ہے۔ یہ تحریک دو تین دہائیوں تک Mexico کے قدیم باشندوں (Red Indians) کو سیاسی اور سماجی طور پر متحرک (mobilize) کرتی رہی اور 1990ء کی دہائی کے اوائل تک ایک عظیم عوامی تحریک کی شکل اختیار کر گئی۔ اس کی قیادت میں لاکھوں افراد نے دارالحکومت (Mexico City) پر قبضہ کر لیا، لیکن اس تحریک نے حکومت وقت کو معطل نہ کیا کوئی نئی حکومت قائم نہ کی بلکہ صرف ایسے مطالبات منوائے جن سے Mexico کا ریاستی نظام مفلوج ہو کر امریکا کا کلیتاً محتاج ہو کر رہ گیا اور اب Zapista کی تحریک Mexico میں امریکی حکومت کے مفادات کے تحفظ کا کام انجام دے رہی ہے اور عالمی سرمایہ دارانہ نظام میں Mexico پوری طرح ضم ہو کر رہ گیا ہے۔

تحریکاتِ اسلامی اور دورِ حاضر کی انارکسٹ تحریکیں:

چوں کہ دورِ حاضر کی انارکسٹ تحریکیں، تحریکِ نسواں، ماحولیاتی تحریک, عالمی امن کی تحریک Anti Nuclear and Peace Movements, اغلام بازوں کی تحریک وغیرہ، آزادی کو فروغ دینے کی تحریکیں ہیں لہٰذا وہ لازماً عالمی سرمایہ دارانہ نظام کو مستحکم کرنے والی تحریکیں ہیں۔ یہ سب اسلام دشمن تحریکیں ہیں کیوں کہ اسلام بندگی اور عبودیت کی بنیاد پر اپنا نظامِ زندگی استوار کرنا چاہتا ہے۔ ہمیں ان تمام تحریکوں کی بھرپور اصولی اور عملی مخالفت کرنی چاہیے۔

دورِ حاضر میں یہ انارکسٹ تحریکیں عرب دنیا میں ایک بڑے خطرہ کے طور پر ابھر کر سامنے آئی ہیں۔ تیونس مراکش، لیبیا اور مصر میں 2011ء سے آنے والی عوامی تحریکات حصولِ آزادی کی تحریکات ہیں اور New Social Movements کے بہت سے مطالبات کو ان تحریکات نے اپنا لیا ہے۔ عرب بہار (Arab Spring) کا معاشرتی اظہار اسلامی نہیں، اس کا سب سے اہم ثبوت تحریر اسکوائر (Tahrir Square) میں بروئے کار آنے والی معاشرت ہے جہاں ہم اسلامی فضا قائم کرنے میں ناکام رہے اور فسق و فجور کے طوفان بدتمیزی کا سیلاب شرع کی بیشتر حدود کو پامال کر گیا۔

اخوان المسلمون نے کسی عرب ملک میں آزادی کو بحیثیت ھدف رد نہیں کیا۔ ان ممالک میں رائج شدہ سرمایہ دارانہ نظام میں اب تک کسی ہیئتی تبدیلی کی کوئی نشانی نہیں ملتی۔ امریکا اور اسرائیل کے خلاف ہم ابھی تک کوئی موثر اقدام نہیں کر سکے۔ ابھی تک ہماری تمام توقعات پارلیمانی دستوری نظام میں شمولیت سے ظاہراً وابستہ نظر آتی ہیں۔

میرا گمان ہے کہ اخوان یہ رویہ اختیار کرنے پر مجبور ہے، راضی نہیں ہے۔ اخوان کا ایک عام کارکن اور اس کی قیادت اسلام کے مخلص ترین شیدائیوں پر مشتمل ہے۔ اخوان اللہ پر، رسولوں پر اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ وہ آزادی و مساوات اور ترقی پر کیسے ایمان لا سکتے ہیں۔ جمہوری دستوری نظام سرمایہ دارانہ نظام زندگی کو مسخر کرنے کے جو مواقع فراہم کرتا ہے اخوان اس سے فائدہ اٹھانے کی پوری صلاحیت اور عزم رکھتے ہیں۔ جمہوری دستوری نظام پر انحصار کی مجبوری کو کم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اخوان کی قیادت:

۱......ترکی کی جسٹس اینڈ ڈویلپمنٹ پارٹی کے نظریات اور حکمتِ عملی کو صریحاً رد کرے۔

۲......معاشرہ میں آزادی، مساوات اور ترقی کے کفریہ نظریات ہونے کا شعور بتدریج پیدا کرے اور اسلامی روحانیت سے مصری انفرادیت اور معاشرت کو سرشار کر دے۔ اپنے دورِ ابتلا میں حاصل کردہ تجربات سے فائدہ اٹھا کر اخوان یہ کام بحسن وخوبی انجام دینے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔

۳...... نیوسوشل موومنٹس کو استعمار اور اسرائیل کی ایجنٹ تنظیموں کے طور پر عوام میں مشتہر کرے اور عوامی حقوق کے حصول کی تمام تحریکات کو De-legitimise کرے۔ حقوق کے حصول کی تحریکوں سے کسی سطح پر اشتراکِ عمل کو روا نہ رکھے۔ بلکہ ان تحریکات کے قائدین کو مصری ریاست کے غدار اور اسرائیل اور امریکا کے کاسہ لیس ایجنٹوں کے طور پر عوام میں مشتہر کرے اور فواحش اور منکرات پھیلانے والے شیطانی ٹولوں کے طور پر متعارف کرائے۔

۴......اسلامی نظام اقتدار کو استوار کرنے کے لیے مساجد و مدارس کو بنیاد بنا کر ریاست کی ترتیب نو کی داغ بیل ڈالے اور ایک مربوط اور ہمہ جہت حکمتِ عملی کے تحت ریاستی اداروں، فوج، پولیس سول انتظامیہ، عدلیہ، میڈیا اور تعلیمی اداروں کو مساجد اور مدارس کے زیر تسلط لے آئے۔

۵......سرمایہ دارانہ ریاستی نظام کی تحلیل اور اسلامی نظامِ اقتدار کی ترتیبِ نَو کے عمل سے داخلی اور خارجی ریاستی پالیسیوں میں تبدیلی کے عمل کو مربوط کر دے۔

مصر میں (اور شاید کچھ دیگر عرب ممالک میں بھی) ایک اسلامی گروہ کی حکومت قائم ہے۔ اس اسلامی گروہ کی حکومت کی بقا کا انحصار سب سے زیادہ اس بات پر ہے کہ یہ اسلامی حکومت، ایک اسلامی ریاست (یعنی اسلامی نظام اقتدار) قائم کرنے میں کامیاب ہوتی ہے یا نہیں۔ اگر ہم نے اسلامی ریاست کے قیام کی ضرورت اور اولیت سے انکار کیا اور سرمایہ دارانہ ریاستی نظام کی اسلام کاری پر اکتفا کیا تو ہمارا حشر جسٹس اینڈ ڈویلپمنٹ پارٹی جیسا ہوگا جس کو آج اوباما Nato's Islamist کہتا ہے۔

پوسٹ ماڈرن ازم کیا ہے

پوسٹ ماڈرن ازم کے تاریخی ماخذ:

تنویری عقلیت (Enlightenment Epistemology) کی سرمایہ دارانہ تنقید پوسٹ ماڈرن ازم (Post-Modernism) ہے۔ اس فکر کے بانی فلسفی، شوپن ہاوئر (Schopenhouer) اور نطشے (Neitzsche) ہیں۔ ان دونوں نے انیسویں صدی کے جرمنی میں زندگی گزاری۔ شوپن ہاوئر کی فکر قدیم ہندو فلسفہ اور کانٹ (Kant) کے فلسفہ کا ایک عجیب ملغوبہ ہے۔ شوپن ہاوئر اور نطشے دونوں عیسائیت سے شدید نفرت کرتے تھے اور قدیم یونان کے پرستار تھے۔ یہ دونوں جرمن رومانوی تحریک سے متاثر تھے۔ یہ تحریک تنویری فلسفہ کی مخالف سرمایہ دارانہ توجیہات پیش کرتی ہے۔ شوپن ہاوئر کے مطابق حقیقت (Kants, Thing in itself) صرف انفرادی ارادۂ انسانی (My will) میں مضمر ہے۔ انفرادی ارادہ (My will) شوپن ہاوئر کہتا ہے کہ ابدی ہے۔ My will پورے کائنات پر محیط ہے۔ My will اور Universal Will ''ارادہ کائنات'' ایک ہی چیز ہے۔ My will ایک ایسے Universal Will کا اظہار ہے جو کائنات میں ہمہ موجود (Omnipresent) اور یکساں ہے۔ Schopenhouer کی فکر میں ''ہمہ اوست'' سے مراد یہ ہے کہ کائنات کا اظہار My will میں ضم ہے۔ My will کے علاوہ کائنات کا کوئی شعوری وجود نہیں۔

شوپن ہاوئر کے مطابق My Will ایک شیطانی (Evil) قوت ہے اس کا اظہار دکھ (Suffering) کے فروغ کے باعث لامحالہ ہوتا ہے۔ علم صرف My will کی تفہیم کا نام ہے اور علم کا فروغ لازماً دکھ کا فروغ ہے کیوں کہ My Will شیطانیت (Evil) ہے۔ My Will کے اظہار کا کوئی مقصد نہیں کیوں کہ موت لازماً اس اظہار کو ختم کر دیتی ہے۔ ہر شخص مستقل دکھ سہنے پر مجبور ہے۔ آواگون کا فلسفہ اس ہی حقیقت کو آشکار کرتا ہے۔ دکھ سے نجات ارادہ اور خواہش کی تسخیر میں ہے۔ کائناتی لاتعلقی اس کا اظہار ہے۔ شوپن ہاوئر کہتا ہے کہ نروان اس شخص کو نصیب ہوتا ہے جو کشمکشِ حیات سے کلیتاً لاتعلق ہو جاتا ہے اور دنیا کو مایا گردانتا ہے۔ شوپن ہاوئر ۱۸۴۸ کی جرمنی کی انقلابی جدوجہد کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ شوپن ہاوئر اسلام کو ایک قابلِ نفرت نظریہ Detestalre doctrine کہتا تھا۔

شوپن ہاوئر کے مطابق چوں کہ خیر محض ارادہ (My Will) کی نفی ہے لہٰذا خیر اور حقیقت کچھ نہیں (Nothingness) نجات عدم وجودیت ہے کیوں کہ دکھ اور وجود ہم معنیٰ ہیں۔

پوسٹ ماڈرن ازم شوپن ہاوئر کی فکر سے جو دو رویّے قبول کرتی ہے: وہ یہ ہیں

ا...... دکھ ابدی ہے اور اس کے مداوے کی تلاش لاحاصل ہے۔ دکھ سے نجات صرف عدم وجودیت (Nothingness) میں پائی جاتی ہے۔

۲...... ارادۂ انسانی (My Will) خالقِ کائنات ہے۔ علم وہ ہے جو ارادہ (My Will) تخلیق کرے۔ اس نظریہ کے گہرے اشارات برگساں (Bergson) کی فکر میں ملتے ہیں اور علامہ اقبال Bergson سے متاثر تھے۔ ان کے تصورِ خودی میں بھی شوپن ہاوئر کی فکر کی جھلک نظر آتی ہے (لیکن شوپن ہاوئر کے برعکس علامہ اقبال ارادہ (خودی My will) کو ایک تخلیقی (تخریبی نہیں) قوت گردانتے تھے۔ وہ خودی (My Will) کو اظہارِ رضائے الٰہی کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ شوپن ہاوئر ارادہ My Will کو ایک شیطانی قوت گردانتا تھا۔)

نطشے (Nietzsche) اپنے آپ کو شوپن ہاوئر کا پیرو کہتا تھا۔ نطشے انیسویں صدی میں عیسائیت کا سب سے بڑا دشمن (شاید اس اعزاز کا ایک اور مستحق Marx ہے) ایک نہایت عابد و زاہد جرمن پادری کا بیٹا تھا۔ نطشے (Nietzsche) ۱۸۸۸ء میں جب اس کی عمر ۴۴ سال تک پہنچی پاگل ہو گیا اور اپنی موت (۱۹۰۰ء) تک پاگل ہی رہا۔

نطشے یہودیوں سے شدید نفرت کرتا تھا۔ (کچھ Nazi مفکرین (بالخصوص Karl Schmidt) لکھتے ہیں کہ نطشے (Nietzsche) کو ایک یہودی سازش کے نتیجہ میں پاگل قرار دیا گیا تھا)

نطشے کا واحد تصورِ خیر (Virtue) قوت (Power) ہے۔ وہ عیسائیت سے نفرت اس لیے کرتا ہے کہ عیسائیت مظلومیت اور مسکینیت (Humility and meekness) کو اعلیٰ اقدار گردانتی ہے۔ عوام کو دکھ دے کر ہی Übermensch (ہٹلر، نپولین، الطاف حسین) کا غلبہ ممکن بنایا جاسکتا ہے۔ خیر تک رسائی صرف ایک باعزت اشرافیہ (Noble Aristocracy) کے لیے ممکن ہے۔ عام آدمی قابلِ قدر (Valued) زندگی نہیں گزار سکتا۔ Übermensch (فوق اللفطرت قائد) عوام سے جنگ کر کے ان کو اپنے ارادہ کا آلۂ کار بناتا ہے عوام کہتے ہیں ''منزل نہیں رہنما چاہیے۔''

عوام کو Übermensch کی قوت میں اضافہ کے لیے ہر قسم کی اذیت برداشت کرنے کے لیے راضی ہو جانا چاہیے Übermensch کے اقتدار کے لیے انارکی (Anarchy) کو فروغ دینا اور کروڑوں انسانوں کا قتلِ عام خیرِ مطلق (Superme Good) ہے۔ نطشے (Nietzsche) قوم پرست نہیں۔ وہ Übermensch اور باعزت اشرافیہ (Noble Aristocracy) کی عالمگیری بالادستی کا خواہاں ہے۔ Übermensch ہر ریاست کو کچل کر رکھ دے گا (جیسا کہ نطشے (Nietzsche) کے خیال میں Napoleon نے کیا تھا) اور اس کا مقصد صرف قوت کا حصول اور اضافہ ہوگا۔

نطشے (Nietzsche) تمام مذاہب کو جھوٹا گردانتا ہے لیکن عیسائیت سے نفرت اس کے باطل ہونے کی بنیاد پر نہیں کرتا بلکہ اس بنیاد پر کرتا ہے کہ عیسائی اخلاقی (Ethical) تعلیمات Übermensch کے معاشرتی تفوق کی راہ میں حائل ہیں Übermensch، اذیت پسند (Cruel) اور سفاک Ruthless ہوتا ہے۔ حق صرف وہ ہے جو Übermensch کی قوت میں اضافہ کرے۔

ارادہ (My Will) قوت میں اضافہ کا ارادہ (Will to pwer) ہی ہے۔ Will To Power ہی فطرتِ انسانی ہے۔ اس Will to Power کے کئی اظہار ہیں۔ آرٹ، ثقافت اور بالخصوص موسیقی (Music) اس اظہار کے اہم ذرائع ہیں۔ باعزت اشرافیہ (Noble Aristocracy) ہی آرٹ اور Music کو سمجھ اور سراہ سکتی ہے اور اس ہی ستائش کے نتیجہ میں اس کی معاشرتی بالادستی مضمر ہے اور اس Noble Aristocracy اور اس کے Übermensch کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ عوام اس کی قوت کے اضافہ کے لیے دکھ اٹھائیں Übermensch ایک Artist Tyrant (آرٹسٹ سلطان) ہوتا ہے۔ Neizche جرمن موسیقار Wagner کا شیدائی تھا۔ (لیکن جب ان میں جھگڑا ہوا تو واگنر کو یہودی ہونے کا طعنہ دیا۔)

Postmodernism نطشے (Nietzsche) کی فکر سے چند اہم آدرشوں کو قبول کرتی ہے۔ ایک یہ کہ حق کا کوئی معروضی وجود نہیں جو سب پر آشکارہ ہو سکے۔ حق صرف Übermensch کے ارادۂ حصولِ قوت (Will to power) میں مضمر ہے۔ دکھ (Suffering) ابدی ہے اور عوام جب ارادۂ حصولِ قوت کے لیے دکھ برداشت کرتے ہیں تو یہ قابلِ قدر عمل ہے۔ فروغِ حصول قوت کے لیے انارکی (Anarchism) کو فروغ دینا لازم ہے۔ نطشے کے Postmodernism کا سب سے اہم ورثہ اس کی آرٹ اور میوزک کی اقداری فوقیت (Value Superiority) کا اثبات ہے وہ زندگی قابلِ قدر ہے جو آرٹ اور میوزک میں ڈوبی ہوئی ہو Übermensch بنیادی طور پر ایک آرٹسٹ ہوتا ہے۔ Napolean ایک ماہر رقاص تھا۔ ہٹلر مصور تھا۔ الطاف حسین شعر کہتا ہے۔

امریکی فلسفی جان ڈیوی (John Dewey) بھی جو بیسویں صدی کے نصف میں مرا Postmodernism پر اثر چھوڑ گیا۔ Dewey بھی حق اور حقیقت کی ابدیت• (Eternity) کا منکر تھا۔ Dewey کے مطابق حق تاریخ (History) کے تابع ہے آج کا حق آج ہی حق ہے، لہٰذا حق معروضی (Objective) نہیں۔ حق محض ایک گروہ کی آرا کا اتفاق ہے۔ (Dewey لکھتا ہے Truth is the opinion Ultimately agreed to by all who investigate) Dewey کا کلیدی تصور ”inquiry“ ہے، اس کو وہ حق (Truth) کے بجائے استعمال کرتا ہے۔ حق کا کوئی وجود نہیں۔ Inquiry کے ذریعہ فرد یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ اپنے مخصوص (given) حالات کو اپنی بقا (Existence) کے لیے کس طرح تبدیل کرے۔ Dewey کی فکر میں تلاش حق کی جگہ جو تصور ہے یعنی Inquiry وہ محض ایک خاص ماحول میں اپنے مفادات کو محفوظ رکھنے یا فروغ دینے کا ذریعہ ہے Inquery حق کو Instrument بنا دیتا ہے وہ تلاشِ حق کو مفاد کے حصول کا ذریعہ بنا دیتی ہے۔

حق کا کوئی معروضی (Objective) آفاقی (Universal) وجود نہیں۔ کوئی عقیدہ اور عمل معروضی اور آفاقی طور پر اچھا یا برا نہیں ہوتا۔ اچھا عقیدہ اور عمل وہ ہے جو ایک فرد کو اس کے خاص ماحول میں فائدہ پہنچائے، لہٰذا Dewey کے مطابق کوئی معروضی حق ہمیں ایک خاص عقیدہ/عمل پر مجبور نہیں کرتے بلکہ ہم Inquiry کے ذریعہ کائنات کو مسخر کرتے ہیں۔

نطشے (Nietzsche) کی طرح Dewey بھی قوت کا پجاری ہے اور اس کا فلسفہ لبرل اور اشتراکی دونوں قسم کے سرمایہ دار افراد کو مرغوب ہے کیوں کہ یہ سرمایہ داری کے بنیادی اہدافِ آزادی اور تسخیرِ کائنات (Freedom and Progress) کا جواز پیش کرتی ہے۔ اس فلسفہ کو Pragmatism کہتے ہیں اور Postmodernism اس فلسفہ کی بنیادی تعلیمات کو قبول کرتا ہے اور Postmodernism کے جو اثرات تحریکاتِ اسلامی پر مرتب ہوئے ہیں وہ فلسفہ Pragmatism کے ذریعہ ہوئے ہیں۔ تحریکاتِ اسلامی کے سب سے نمایاں Progmatic مفکر جماعت اسلامی کے پروفیسر خورشید احمد ہیں۔ (اور جماعتِ اسلامی کی فکر پر پروفیسر خورشید کے اثر کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جماعت کا ۲۰۱۳ء کا انتخابی منشور پروفیسر خورشید احمد ہی نے مرتب کیا ہے)۔

Postmodrenism کی تنویری عقلیت پر تنقید:

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے Postmodernism تنویری عقلیت کی سرمایہ دارانہ تنقید اس تحریک کے بانی مفکر Schoponhoure، Nietzsche اور Dewey تنویری عقلیت کی تنقید سرمایہ دارانہ رومانویت (Romanticism) کے آدرشوں کے تناظر میں کرتے تھے۔ (سرمایہ دارانہ رومانویت کی ابتدا تحریکِ نشاۃِ ثانیہ (Renaissance) کے دور (پندرھویں صدی) میں شروع ہوئی۔ اس کے اہم مفکرین میں Petrarch,Byron,Herder,Fichte شامل ہیں۔ یہ نہایت دیرپا تحریک ہے اور ۱۹ویں اور ۲۰ویں صدی میں اس کا اثر Heidegger, Husserl اور Sartre تک پر دیکھا جا سکتا ہے۔) بیسویں صدی کے پہلے نصف میں یہ تنقید Post Marxist مفکرین نے جاری رکھی جن میں Horkheimer,Adorno اور (کسی حد تک) Lucracs نمایاں تھے۔

1960ء کی دہائی میں یورپ اور امریکا میں ایک عظیم سماجی تغیر رونما ہوا جس کا سب سے اہم اظہار جنسی بے راہ روی اور عریانیت کی عوامی مقبولیت کے طور پر ہوا۔ سرمایہ دارانہ نظام کا انحطاط بیسویں صدی کی ابتداء سے شروع ہوتا ہے اور پہلی جنگِ عظیم (1914-1918) سرمایہ داری کی تاریخ میں ایک اہم سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس جنگ کے نتیجہ میں:

۔۔ کروڑوں عورتیں گھروں سے نکل کر ملازمت کرنے پر مجبور ہوگئیں۔ ساتر لباس ترک کرنا اور مزدوروں سے مستقل روابط رکھنا پیشہ ورانہ ضرورت بن گئی۔ (چوتھی صدی عیسوی سے لے کر بیسویں صدی کے آغاز تک یورپ میں عورتیں ساتر لباس استعمال کرتی تھیں۔ حجاب (Bonnet) عام تھا۔ Nuns نقاب استعمال کرتی تھیں۔ عفت (Chastity) عیسائیت کی ایک کلیدی قدر تھی۔)

۔۔ یہ بات واضح رہے کہ سرمایہ دارانہ عمل امن پر نہیں شدید جنگ وجدل اور قتل وغارت پر منتج ہوتا ہے۔

۔۔ سرمایہ دارانہ معاشرت کی قائم کردہ واحد اجتماعیت منتشر ہونا شروع ہوگئی۔ یہ مزدوروں کی اجتماعیت (The Collectivity of labour) تھی جس نے مذہبی اجتماعیت (The Collectivity of Christendom) کی جگہ لی اور سرمایہ دارانہ عدل کی جدوجہد مشکل سے مشکل تر ہوگئی (مزدور اجتماعیت کی تحلیل نے دو شکلیں اختیار کیں، سوشل ڈیموکریٹ جماعتیں لبرل قوم پرست نظام میں

ضم ہوگئیں اور کمیونسٹ مزدور تنظیمیں اشترا کی ریاستی نظام بالخصوص اس کی بیوروکریسی (Bureaucracy) میں ضم ہوگئیں)۔

ان عوامل کے نتیجہ میں بہت سے مفکرین تنویری عقلیت کے ناقدین بن گئے۔ امریکا کی ویت نام (Vietnam) کی جنگ بھی ایک اہم سنگِ میل ہے۔ اس جنگ میں امریکی شکست اور اس کے نتیجہ میں Bretton Woods کے نظام کی تحلیل (یہ ایک عالمی مالی نظام تھا جو 1946ء سے 73-1972 تک نافذ رہا۔ اس نظام کے تحت تمام کرنسیوں Currencies کا شرح تبدل IMF ڈالر میں متعین کرتا تھا اور ڈالر کا شرح تبدل سونے کے مقابلے میں تھا۔ امریکی حکومت اس کی پابند تھی کہ ایک اونس سونا 35 ڈالر کے عوض دے۔ Nixon نے 1971ء میں اس سے انکار کردیا) نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور ۱۹۷۰ء کے بعد سے تنویری عقلیت پر تنقید عام ہوگئی اور سرمایہ دارانہ نظام کی Postmodrenist توجیحات پیش کی جانے لگیں۔ یہ اس ہی رومانوی تحریک (Romantic Movement) کا احیاء ہے جس کا تعارف ہم پچھلی فصل میں پیش کرچکے ہیں۔ آج جرمنی اور فرانس کا تقریباً ہر اہم مفکر کسی نہ کسی حد تک Postmodernism آدریشوں کا وکیل ہے (یہ بات Habermas کی سیاسی اور سماجی فکر تک کے بارے میں کہی جاسکتی ہے گو کہ Habermas آج تنویری عقلیت کا سب سے اہم نمائندہ گردانا جاتا ہے)۔ جدید Postmodernist مفکرین Foucault، Derrida، Baudelaire، Rorty، Walzer، Lyotard، Marcuse، Wallenstein، Urry، Charles Taylor اور Harel وغیرہ ہیں۔ ان مفکرین کی نگارشات کا اسلامی نقد مولانا محبوب الحسن بخاری سنابل میں گاہ گاہ پیش کریں گے۔ ان شاءاللہ (مولانا سید محبوب بخاری Derrida کے مابعد الطبیعات تصورات پر اپنا Ph.d کا مقالہ تحریر فرما رہے ہیں)۔

ذیل میں ہم تنویری فکر کی Postmodernism تنقید کا ایک اجمالی خاکہ پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔

تنویری عقلیت کی تنقید:

Postmodernist مفکرین سائنسی منہج (Scientfic Method) کی معقولیت کے قائل نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس منہج کی ترویج کے نتیجہ میں عالمی سرمایہ دارانہ نظام ماحولیاتی، معاشی اور سماجی بحرانوں Crisis سے دوچار ہورہا ہے۔

اس منہج کی بنیاد پر معاشرتی عمل میں علل Cause اور نتیجہ Effect کا تعین ناممکن ہے (یعنی Complexity theory کی معاشرتی تعبیر Social Application) یہ بتاتی ہے کہ معاشرتی علل اور نتائج کا تعلق پیچیدہ اور Linear نہیں Complex ہے یعنی پیچیدہ اور ہمہ جہت ہے اور کسی معاشرتی عمل (علل) کے نتیجہ کا تیقن نہیں کیا جاسکتا۔ ناش (Nash) کہتا ہے کہ علم ایک معاشرتی تعمیر (Social Construct) ہے۔ علم کی تعمیر (Construction) کا مقصد قوت (Power) کا حصول اور استعمال ہے۔ کسی عمل یا شے کے کوئی درست معنی نہیں ہوتے۔ Baudrillard کہتا ہے کہ حق کا کوئی آفاقی تصور موجود نہیں اور تمام نظاماتی آدرش (Metanrratives) (**مثلاً سوشلزم، لبرل ازم، قوم پرستی، اسلام، عیسائیت، فلسفہ، سائنس، اکنامکس (Economics) نسوانی تحریک (Feminism) وغیرہ**) لغو اور نامعقول ہیں۔ Baudrillard کہتا ہے کہ میڈیا (Media) کے پاس وہ قوت ہے جو حقیقت تعمیر کرسکتی ہے۔ اس Media کی تعمیر شدہ حقیقت کو بودی لا Hyper reality کہتا ہے۔ حقیقت کچھ نہیں Hyper Reality سب کچھ ہے۔

Legg کہتا ہے کہ علم کی تعمیر کا مقصد اقتدار کا استحکام ہے۔ علم تحکیم (Governmentally) کو اس طرح ممکن بناتا ہے کہ وہ محکوم کو حاکم کی ریاستی حکمتِ عملی کی معقولیت پر قائل کرتا ہے۔ تحکیم (Governmentally) ایسے معاشرتی اداروں کے ذریعہ کی جاتی ہے جو رائج شدہ علمیت کی بنیاد پر جائز (Legitimate) ثابت کیے جاتے ہیں۔

تحکیم (Governmentally) کے لیے معاشرتی کشمکش (Conflict) مستقل جاری رہتی ہے کیوں کہ دورِ حاضر کے سرمایہ دارانہ نظام میں بقول اپادورائے (Appadurai) علم کی جگہ نظریاتی تناظر (Idea Scapes) نے لے لی ہے (Habermas کے تضادات پر ہمارے دوساتھی ڈاکٹر علی محمد رضوی اور جناب ذیشان ارشد کام کررہے ہیں۔ ان کی تحریرات بھی سنابل میں گاہے گاہے پیش کی جائے گی۔ یہ دونوں حضرات جماعتِ اسلامی کے رکن ہیں۔) Habermas (جو دورِ حاضر کا سب سے اہم Modernist فلسفی گردانا جاتا ہے) اقرار کرتا ہے کہ حالیہ سوشل تحریکات New Social Movements ایک ایسے نئے سرمایہ دارانہ تعقل کو جنم دے رہی ہیں جو سرمایہ دارانہ معاشرہ کا دفاع، سرمایہ دارانہ معاشی اجارہ داری اور سرمایہ دارانہ ریاستی پالیسی کے لیے ضروری ہے۔ (New Social Movements میں تحریک ردعالمگیریت (World Social Movement) ماحولیاتی تحریک، تحریکِ نسواں، تحریک اغلام باز (LGBT) وغیرہ شامل ہیں)۔ اس معاشرتی علمیت کی بنیاد پر بھی سرمایہ دارانہ تحکیم یعنی جمہوریت فروغ پارہی ہے۔

Post Modernism مفکرین کہتے ہیں آج بیشتر افراد کے لیے آزادانہ فیصلہ کرنا اور اظہارِ پسندیدگی (Free Choice) ناممکن ہوگیا ہے۔ ایک ایسی عالمی اشرافیہ (Globel Elite) غالب آگئی ہے جو ایک خاص معاشی نظریہ پر اعتقاد رکھتی ہے اور یہ اشرافیہ بین الاقوامی اداروں، عالمی سرمایہ دارانہ کمپنیوں اور ریٹنگ ایجنسیوں (Rating Agencies) کے ذریعہ اس نظریہ کے مطابق عوام کی رائے تشکیل دیتی ہے۔ لوگ وہی پسند کرتے ہیں جو یہ محدود اشرافیہ چاہتی ہے کہ وہ پسند کریں۔ Foucault کہتا ہے کہ آزادی صرف اس اشرافیہ کو میسر ہے اور باقی تمام افراد آزادی سے ان معنوں میں محروم ہیں کہ ان کے فیصلے اس ہی اشرافیہ کی پسند کے مطابق مرتب ہوتے ہیں۔

۲.....تنویری انفرادیت کی تنقید:

Postmodernist مفکرین کہتے ہیں کہ اب انفرادی خودکفالت (Self Autonomy) کا تنویری تصور لغو ثابت ہوگیا ہے۔ علمیت معروضی انفرادی ادراک سے برآمد نہیں ہوتی جیسا کہ Kant سمجھتا تھا بلکہ Macluhan کے مطابق اب فرد ایک غیر مطمئن خانہ بدوش (Nomadic) وجود ہے، جو ادراکِ ذات کے عمل کو مستقلاً معطل کرنے پر مجبور ہے۔ علمیت ادراک ذات کو ممکن نہیں بناتی بلکہ وہ

فرد کو اشرافیہ کے غلبہ پر مجبور کرنے کی ناگزیریت کی توجیح ثابت کرنے کا ذریعہ ہے۔

دورِ حاضر میں انفرادیت غیر مرکزی (Decentralized) ہوگئی ہے اور انتشار کا شکار ہے۔ فرد نہ اپنے خاندان سے تعلق رکھتا ہے نہ اپنی قوم سے نہ اپنے طبقہ (Class) سے۔ انفرادیت غیر مستحکم اور پیچیدہ (Complexified) ہوگئی ہے۔

انفرادیت بکھر گئی ہے اور انفرادیت کی شناخت کے متعدد سرچشمہ ہیں جو آپس میں متصادم ہیں۔ ان حالات میں اس Postmodernist دنیا کا عام باشندہ عقل کی بنیاد پر فیصلہ کرنے والا (Rational chooser) تصور نہیں کیا جا سکتا Network theory انفرادیت کو تعلقات کے ایسے نکتہ ہائے ارتباط (Loci of relationship) گردانتی ہے، جو زیادہ عرصہ تک مستحکم نہیں رہتا۔ اور یہ نظام ارتباط نظاماتی عمل کا تعین کرتے ہیں۔ فرد یہ کام نہیں کر سکتا اور نظاماتی تغیر میں کسی فرد کو کوئی اہمیت نہیں۔

Urry لکھتا ہے "رقص فیصلہ کن ہے، رقاص نہیں۔" یہ رقاص رقص کے ضوابط کا لازمہ اثیر ہے۔ اس Postmodernist دنیا کی تفہیم رقص کی تنظیم کے ادراک سے حاصل ہوتی ہے انفرادی رقاصوں کے عقائد اور اعمال کے ادراک سے حاصل نہیں ہوتی۔ فرد اپنے لوکل (Local) ماحول سے لاتعلق ہو رہا ہے لیکن کسی عالمی (Global) ماحول میں کسی شناخت کی بازیافت سے قاصر ہے۔ لوکل اور گلوبل شناخت کی یہ کشمکش سرمایہ دارانہ مخالف انفرادیت۔ بالخصوص "دہشت گرد" شخصیتوں (یعنی مجاہدینِ اسلام) کو پروان چڑھا رہی ہے۔

Postmodernism سرمایہ دارانہ انفرادیت متضاد اور متصادم تصوراتِ حیات (Ontologies) کو جمع کرنے کی ناکام سعی ہے۔ دلوز (Deluze) کہتا ہے کہ یہ شخصیت Schizoid (اوہام کا شکار) ہے اور کوئی حتمی شناخت نہیں رکھتی۔ Post Modren فرد ایک آوارہ گرد (Stoller)Vagabond (لوفر) کھلاڑی (Player) اور سیاح ہے۔ وہ زندگی چھوٹی چھوٹی غیر مربوط مہمات (Projects) کی لاحاصل جستجو میں گزار دیتا ہے۔ وہ "ذات کا تاجر" (Entrepreneur of the self) بن گیا ہے اور اس کے لیے زندگی کھوکھلی، بے معنی اور غیر مربوط عمل کا ایک ناقابل تفہیم سلسلہ بن کر رہ گئی ہے۔ Baumar کہتا ہے آج کی دنیا طاعون (Plague) بھکاریوں (Beggars) اور اوہام (Superstitions) سے بھری پڑی ہے۔ اس ماحول میں انفرادیت مستقل خطروں سے ہمہ وقت دوچار ہے اور یہ خطرات انفرادی ہیں۔ طبقاتی معاشرتی نہیں۔ Precariat (مستقل خطروں سے پریشان، غیر محفوظ) اکثریت نے Prolitariat (پرولتاری طبقہ) کی جگہ لے لی ہے۔ اس Precariat کا فرد citizen نہیں ہو سکتا کیوں کہ وہ تمام نظاماتی آدرشوں (Metanarratives) بشمول لبرل ازم، سوشل ازم اور قوم پرستی کو لغو اور بے معنی تصور کرتا ہے۔ وہ شکایتوں، محرومیوں اور نفرتوں سے بھری ایک Frustrated شخصیت ہے۔

۳......تنویری ریاست کی تنقید:

تنویری سرمایہ داری نے ایک Sovereign (خودمختار، مطلق العنان) قومی ریاست قائم کی تھی۔ Postmodern نظامِ اقتدار اسی قومی ریاست سے اقتدار چھین رہا ہے۔ آج قومی ریاستیں ایک عالمی نظامِ اقتدار کی چوکیدار (Game Keeper) بن کے رہ گئی ہیں۔ ریاستی اقتدار کو چیلنج کرنے والی تمام قوتیں۔ فنانس (Finance) ملٹی نیشنل کمپنیاں، میڈیا، نیو سوشل مومنٹس (New Social Movements) (یعنی تحریکات، نسواں، اغلام بازی (LEBT)، ماحولیات اور World Social Forum) قومی ریاست کے اقتدار کو کھوکھلا کر رہی ہیں اور مجاہدینِ اسلام "دہشت گرد" (Post Modernist "دہشت گرد" کیٹیگری میں ہندوستان کے ماؤسٹوں اور لاطینی امریکا کے گوریلوں کو بھی شامل کرتے ہیں) ریاستی اقتدار کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہیں۔ قومی ریاستی Citizenry بھی مفاداتی (Interest Oriented) اور نسلی گروہوں میں تقسیم ہوگئی ہے اور "قومی مفاد" سے وابستگی ناپید ہے ایسے میں لبرل اور سوشلسٹ تصور Citizenship بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔

Urry کہتا ہے کہ عالمگیریت (Globalization) ایک نامکمل اور تضادات سے لبریز عمل ہے۔ ریاستی اقتدار کو سبوتاژ (Sabutage) کرنے والی سب سے مہلک قوت آئی ٹی سیاسی قوت کا سرچشمہ بن گئی اور اقتدار کا ایک نظام قائم ہوا ہے جہاں بااقتدار گروہوں کا معاشرتی لگاؤ مفقود ہوتا جا رہا ہے۔ ریاست کی جگہ جو نیا گلوبل نظامِ اقتدار قائم ہو رہا ہے وہ نظر نہیں آرہا اور یہ بتانا کہ کس نے کون سا فیصلہ کیا اور فیصلے کیسے ہوتے ہیں مشکل سے مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ اس نظامِ اقتدار کو (Post Panopticon) نظامِ اقتدار کہتے ہیں (Foucault اس اصطلاح کا موجد ہے وہ کہتا ہے کہ سرمایہ دارانہ ریاست اس جیل کی مانند ہوتی تھی جہاں ایک ایسا مرکزی مقام تھا جہاں بیٹھ کر جیلر تمام شہریوں کی ہر حرکت پر نظر رکھ سکے۔ Post Panopticon نظام اقتدار میں یہ ممکن نہیں۔ یہاں جیلر کون ہے اور قیدی کون، بتانا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس میں حاکم اور محکوم کی شناخت ناممکن ہوتی جاتی ہے۔

اس نظامِ اقتدار میں جمہوریت کے کوئی معنی نہیں رہتے۔ حکام جو بین الاقوامی اداروں، فنانشل (Financial) مارکیٹوں، ملٹی نیشنل کمپنیوں، ریٹنگ ایجنسیوں، میڈیا، سیاسی لیبر وٹریڈ یونینیوں اور سماجی تھنک ٹینکس (Think Tanks) میں پوشیدہ ہیں ان کی جمہوری جواب طلبی کا کوئی امکان نہیں۔ سکوکپول (Skocpol) کہتی ہے کہ جمہوری جواب طلبی ایک مضحکہ خیز افسانہ کے علاوہ اور کوئی حیثیت نہیں رکھتی کیوں کہ گلوبل بااقتدار اشرافیہ صرف سرمایہ کے بازار کی نمائندہ ہے کسی جمہور کی نمائندہ ہو ہی نہیں سکتی۔ ان حالات میں عوام کا جمہوری عمل سے بتدریج لاتعلق ہونا ناگزیر ہے۔ جمہوری عمل میڈیا پر جاری تفریح بن کر رہ گیا ہے۔ سیاسی قائد پوپ اسٹار (Pop Star) بن گئے ہیں۔ (اس کی بہترین پاکستانی مثال عمران خان ہے)۔ ووٹ دینے کی شرح پوری دنیا میں روبہ تنزل ہے۔ جمہوری اداروں پر عوامی اعتماد مفقود ہوتا جا رہا ہے۔ Post Modern فرد کو کسی پر کنٹرول (Control) نہیں۔ نہ اپنے خاندان پر، نہ اپنے کاروبار پر، نہ اپنے ماحول پر نہ اپنی حکومت پر، نہ اپنے ملک پر، نہ اپنی دنیا پر، اور جب ہر فرد بے اختیار ہے تو معاشرتی اختیار کو منظم کرنا اور رکھنا نہایت دشوار گزار عمل ہے۔

Held نے Cosmocracy کا تصور پیش کیا ہے۔ اس سے مراد عالمگیر جمہوریت ہے جو قومی جمہوریت کی جگہ لے رہی ہے لیکن Zizek اور Badiou کہتے ہیں کہ Cosmocracy محض استعمار (Imperialism) کا ایک نیا جواز

ہے Cosmocracy کا عملی اظہار صرف ان ممالک میں امریکی مداخلت سے ہوتا ہے جو اقوام متحدہ کے وضع کردہ سرمایہ دارانہ حقوق اپنے شہریوں کو نہیں فراہم کرتے۔ اس کے علاوہ Cosmocracy کچھ نہیں، اگر Cosmocracy کی کوئی حقیقت ہے تو امریکا کیوں دنیا کے ہر باشندہ کو اپنی شہریت (Citizenship) نہیں دیتا۔

امریکا ایک بتدریج روبہ تنزل انفرادیت، معاشرت اور نظامِ اقتدار ہے Deluze کے مطابق وہاں کی عظیم اکثریت Schezoid اور Paranoid ہے۔ معاشرتی انتشار تیزی سے بڑھ رہا ہے، ہر دہائی میں ایک معاشی بحران رونما ہو رہا ہے۔ امریکی نظامِ اقتدار کے خلاف عسکری جدوجہد کئی دہائیوں سے ایشیاء، افریقا اور لاطینی امریکا میں جاری ہے اور اب کئی مقامات پر...... مالی، افغانستان، یمن، فاٹا، بہار، جھارکھنڈ، بوڈولینڈ، کولمبیا وغیرہ میں انقلابی ریاستی ڈھانچہ اپنی قومی حکومتوں سے نبرد آزما ہیں اور امریکا ان پر قابو پانے سے قاصر ہے۔ (ان انقلابی ریاستی صف بندیوں کو Mezzanine States کہا جاتا ہے) ابھی تک یہ انقلابی مزاحمتی صف بندی عالمی سرمایہ دارانہ نظام کی سرحدوں (Peripheries) تک محدود ہے لیکن یہ سرمایہ دارانہ مراکز تک پھیلنے کی استطاعت رکھتی ہے۔ اس انقلابی جدوجہد نے سرمایہ دارانہ نظامِ معاشرت اور اقتدار کو پرخطر بنا دیا ہے۔ پورا سرمایہ دارانہ نظام ''دارالامن'' اور ''دارالحرب'' میں تقسیم ہو گیا ہے اور دارالحرب دارالامن میں سرائیت کرنے کی صلاحیت حاصل کر رہا ہے۔ Bauman کہتا ہے کہ سرمایہ دارانہ عالمگیریت کا دوسرا نام World Risk Society ہے۔

تنویری معاشرت کی تنقید:

Post Modernism مفکرین کے مطابق سرمایہ، معاشرت اور معیشت کو سب سے بڑا خطرہ ماحولیاتی آلودگی اور تنزل (Enviorenmental depletion) سے ہے۔

Bellamy Foster کہتا ہے کہ اپنے ابتدائی دور سے آج تک سرمایہ داری فطرت سے عالمِ جنگ میں ہے۔ سرمایہ کی لامحدود بڑھوتری کی جدوجہد دنیا کو برباد کیے دے رہی ہے۔ تباہ کن موسمیاتی تبدیلی واقع ہو رہی ہے۔ طوفان، خشک سالی، زلزلہ ہر سال سرمایہ داری پر حملہ آور ہونے لگے ہیں۔ قدرتی وسائل، میٹھا پانی، جنگلات، تیل اور دیگر دھاتوں کے خزانے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خالی کیے جا رہے ہیں اور اس عالمگیر تباہی کو کوئی نہیں روک سکتا۔ نہ قومی حکومتیں نہ بین الاقوامی ادارے نہ ملٹی نیشنل کمپنیاں نہ سائنس دان کیوں کہ فطرت سے سرمایہ داری کی جنگ سرمایہ دارانہ کلیدی ہدف، ترقی کی مسلسل جستجو ہے اور ترقی کا مطلب ہی تسخیرِ فطرت ہے۔ سرمایہ داری اس جنگ کو ختم نہیں کر سکتی۔ وہ یہ جنگ لازماً ہار جائے گی اور بیشتر Environmentalist سائنس دانوں کا خیال ہے کہ اس شکست کے وقوع پذیر ہونے میں زیادہ دیر نہیں لیکن ان کے خیال میں سرمایہ داری کی شکست اور کرۂ ارض کا تباہ ہونا ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔

ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے

سرمایہ دارانہ معاشرتی بحران کا دوسرا اظہار اس بات سے ہوتا ہے کہ آج کل سرمایہ دارانہ عدل کا کوئی مربوط تصور پیش نہیں کیا جا سکتا۔

انیسویں صدی کے آخر میں سرمایہ داری جب لبرل تشکیلِ معاشرت سے دوچار ہوئی تو سوشلسٹوں نے سرمایہ دارانہ عدل کا ایک دوسرا مقبول عام تصور پیش کیا۔ یہی کام ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کی دہائیوں میں Keynes اور اس کے پیرووں نے کیا لیکن آج کی سرمایہ دارانہ اصلاحی (Reformist) تحریکیں یہ کام کرنے سے قاصر ہیں۔ یہ تحریکیں جو (New Social Movements) کہلاتی ہیں سرمایہ دارانہ نظام کے کسی ایک سرمایہ دارانہ ظلم کو تلف کرنے کی جدوجہد کرتی ہیں لیکن ان میں یہ سکت نہیں کہ سرمایہ دارانہ معاشرت اور ریاستی ڈھانچہ کی کسی ہمہ جہت ترتیبِ نو کو ممکن بنا سکیں۔ لہٰذا ان کی مہمات تفریح اور کھیل تماشے سے آگے نہیں بڑھتیں اور ان کی معاشرتی تنقید کی بنیاد پر کوئی نئی عوامی جدوجہد پیدا نہیں ہوتی۔ New Social Movement کے آدرشوں اور تنقید کو استعماری ادارہ (مثلاً IMF اور World Bank) با آسانی اپنے عملی مباحث (Policy Discourse) میں ضم کر لیتے ہیں۔

گلوبل Civil Society ایک عام آدمی کو اپنے میں ضم کرنے کی سکت نہیں رکھتی۔ گلوبل اشرافیہ کے ماتحت جو معاشرہ قائم ہوتا ہے وہ پیہم انتشار کا شکار رہتا جاتا ہے۔ ایسے لوگ جو اس معاشرہ میں اپنے آپ کو اجنبی گردانتے ہیں، ان کو Underclass کہتے ہیں۔ ان کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ معاشرتی انتشار کو ختم کرنے اور معاشرتی تفہیم کو فروغ دینے کا کوئی مرکزی محور موجود نہیں۔ معاشرتی مکالمہ بتدریج ناممکن ہوتا جاتا ہے کیوں کہ ایسے معاشرہ میں اقداری ارتباط مفقود ہو جاتا ہے۔ ہر شخص اپنے مجبور، محروم، خطرات میں گھرا ہوا اور مایوس ہوگا۔ یہی احساس رکھنا Schizophrenia ہے اور آج امریکہ میں Schizophrenia ایک وبا کے طور پر پھیل گیا ہے۔ بقول Jones وہ ایک Mass Phenomena ہے اور ہر امریکی کسی نہ کسی حد تک اس کا شکار ہے۔ (امام خمینی نے آج سے ۲۵ سال پہلے فرمایا تھا ''ہر امریکی شیطانِ بزرگ ہے۔'') ایسے میں معاشرتی ارتباط اور ہم آہنگی (Social integration and solidarity) کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ معاشرتی زندگی میڈیا اور آئی ٹی (Information Technology) میں ضم ہو جاتی ہے۔ معاشرتی تعمیر جو مستقل وقوع پذیر ہوتا ہے بتدریج ناقابلِ فہم ہوتا چلا جاتا ہے۔

ماڈرن ازم اور پوسٹ ماڈرن ازم

Postmodernism کی اس انفرادی، معاشرتی اور ریاستی تنقید کا Modernism کے فلسفیوں کے پاس کوئی ہمہ گیر جواب موجود نہیں۔ وہ سب (Habermas, Callincos, Gadamar, Rawls) اس تنقید کے مختلف پہلوؤں کو اپنی فکر میں سموتے ہوئے اور Postmodernist تنقیدوں (Discourses) پر وضاحتی حاشیے لکھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کا جزوی تنقید کا ٹیپ کا بند یہ ہے کہ Postmodernism ماڈرن ازم ہی ہے۔''

اور یہ بات درست بھی ہے اور غلط بھی۔ غلط ان معنوں میں ہے کہ Post Modernism تنویری اہداف، آزادی، مساوات اور ترقی کو نامعقول اور ناقابلِ حصول سمجھتے ہیں اور بلاخوف تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ Postmodernist تنقید آزادی، مساوات اور ترقی کی نامعقولیت اور لاحصولیت ثابت کرنے میں کامیاب ہو گئی ہے۔

لیکن Modernists کا یہ دعویٰ ہے کہ Postmodernists دراصل Modernist ہی ہیں اور جس انفرادیت، معاشرت اور تنظیمِ اقتدار کی تشریح وہ پیش کرتے ہیں وہ Hyper Modernity ہی ہے۔ ان معنوں میں درست ہے کہ Post Modernist سرمایہ دارانہ اہداف...... آزادی، مساوات اور ترقی کو قبول کرتے ہیں رد نہیں کرتے اور گوکہ وہ بحیثیتِ مجموعی سرمایہ دارانہ عدل کے قیام سے مایوس ہیں چند نا انصافیوں کو ختم کرنے کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔ مثلاً Foucault نے اغلام بازوں کے حقوق کے لیے سردھڑ کی بازی لگادی۔ Derrida نے عراق کی 2003ء کی جنگ کی مخالفت میں Habermas کا ساتھ دیا۔ Deluze جانوروں کے حقوق کا بہت فاعل (Active) وکیل ہے۔ Rorty پینشنروں (Pensioners) کے سماجی حقوق کے تحفظ کی تحریک میں شامل ہے وغیرہ۔

سرمایہ دارانہ نظاماتی غلبہ کی توجیہہ دو مذہب دشمن یورپی تحریکوں نے کی۔ ایک تحریک تنویر (Enlightenment) اور دوسری تحریک رومانویت (Romanticism) پوسٹ ماڈرنسٹ تحریک رومانویت کے دورِ حاضر کے پیروکار ہیں۔ ماضیٔ قریب میں ان کے رہنما Neitzsche, Shopenhouer اور Dewey رہے ہیں اور ظاہر ہے یہ سب سرمایہ داری کے وکیل تھے گو کہ ان تینوں نے بھی تنویری معقولیت (Epistemology) کی تردید کی تھی۔

Postmodernism سرمایہ دارانہ اہداف کی تصدیق جمالیاتی (Aesthetic) بنیادوں پر کرتی ہے۔ چارلس ٹیلر (Charles Taylar) کے مطابق چوں کہ وہ یورپی ہے اور اس کی تاریخ لبرل معاشرت کے ارتقا کی تاریخ ہے لہٰذا آزادی، مساوات اور ترقی کا فروغ اس کی تاریخی شناخت کے ہم معنیٰ ہے گوکہ وہ ان اہداف کی معقولیت کا کوئی جواز پیش نہیں کرسکتا۔ اس کا آزادی، مساوات اور ترقی سے لگاؤ ایسا ہی ہے جیسا اس کا کلاسیکی موسیقی، آرٹ، ادب اور رقص سے لگاؤ۔ یہ لگاؤ ہی Charles Taylor، کو Charles Taylor بناتے ہیں، آزادی، مساوات اور ترقی سے غداری اپنی تہذیب اور تاریخ سے غداری ہے۔

Rorty ان خیالات سے متفق ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ درست ہے کہ اس کی تاریخ میں بہت سے ایسے واقعات ہیں جس پر اس کو شرمندہ ہونا چاہیے لیکن Rorty کی تاریخ Rorty کو یہ سکھاتی ہے کہ Rorty ایک قائم بالذات و مطلق العنان خود تخلیقی انفرادیت (Autonomous Being) ہے۔ وہ صرف اپنے آپ کو جواب دہ ہے۔ خدا کو جواب دہ نہیں۔

Rorty کہتا ہے کہ یہ درست ہے کہ ہم نے کروڑوں ریڈ انڈین قتل کیے لیکن چوں کہ ہم خود مختار اور کسی کو جواب دہ نہیں، لہٰذا ہمارا یہ حق ہے کہ ہم اپنے آپ کو معاف کردیں اور کسی سے معافی مانگنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم نے اپنے آپ کو ریڈ انڈینز کے قتل کے لیے معاف کردیا ہے اور اگر کل امریکی ریڈ انڈینوں کے قتلِ عام سے امریکی اپنے کو معاف کرا سکتے ہیں تو آج عراق اور افغانستان اور مجاہدینِ اسلام کے قتلِ عام سے اپنے آپ کو معاف کیوں نہیں کرا سکتے۔ انہیں اپنے آپ کو اس قتلِ عام سے بھی معاف کردینا چاہیے (Rorty امریکن اور Charles Taylar انگریز ہے۔ الحمدللہ کہ دونوں ملعون پچھلے چند سالوں میں جہنم واصل ہوچکے ہیں۔

بیشتر Postmodernist امریکی استعمار کے وکیل اور حلیف ہیں۔ وہ مغربی تہذیب کے عالمی غلبہ کے مدعی اور متمنی ہیں اور جس حکمتِ عملی (Strategy) کے ذریعہ اس کو ممکن بنانا چاہتے ہیں وہ Multiculturalism ہے۔

Multiculturalism سے مراد یہ ہے کہ معاشرہ میں مختلف النوع ثقافتوں کو فروغ پانے کے مواقع ملنا چاہیے لیکن ان ثقافتوں کی ایسی تشریح کو عام کیا جانے جو سرمایہ دارانہ اہداف...... آزادی، مساوات اور ترقی کی اثبات ہو۔ ہر ثقافتی گردہ (Cultural Community) اپنی تاریخی روایات کے تناظر میں آزادی، مساوات اور ترقی کی مستقل جستجو کی توجیح پیش کرے اور سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی میں اپنی منفرد شناخت تلاش کرے۔ Foucalt نے سرمایہ دارانہ قوت (Power) کی وکالت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ قوت تنوع یکسانیت (Unity indivesity) کو ممکن بناتی ہے اور یہی اس کی اصل خوبی ہے۔ ہر فرد اور ہر کمیونٹی سرمایہ/آزادی کی پرستش کرے لیکن اپنے تاریخی ورثہ رسوم، روایات اور میلانات کے مطابق۔

اسلامی جدوجہد اور پوسٹ ماڈرنزم:

مسلم دنیا میں سب سے نمایاں Postmodernist اکبر ایس احمد ہے (یہ ایک آغا خانی ہے، کیمبرج میں پروفیسر تھا اب امریکا میں مقیم ہے) ایک اور پوسٹ ماڈرنسٹ آدرشوں سے متاثر مفکر (جو کہ پہلے Marxist تھا) اقبال احمد تھا جو دس سال قبل اسلام آباد میں مر گیا۔) یہ Multiculturalism کا وکیل اور سلمان رشدی ملعون کا قریبی ساتھی ہے (۱۹۹۱ء میں سلمان رشدی نے اکبر ایس احمد کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا)۔ اس نے Ernest Gellner کے تعاون سے Postmodernist آدرشوں کی اسلام کاری کرنے کی کوشش کی ہے۔

انگلستان اور امریکا میں یہ کوشش ان معنوں میں بار آور ثابت ہوئی ہے کہ وہاں کے کئی اسلامی حلقہ (جن میں کچھ مساجد بھی شامل ہیں) یکجہتی پوسٹ ماڈرنسٹ تحریکوں (New Social Movements) سے اشتراکِ عمل پر آمادہ ہوگئے اور امریکا اور برطانیہ کی مسلم کمیونیٹیوں (Communities) کے معاشرتی مفادات کے تحفظ کے لیے اس اشتراکِ عمل کو ناگزیر سمجھنے لگے۔ اس سے لازماً اسلام کی نظاماتی شناخت مجروح ہوئی ہے اور اسلامی جدوجہد رد سرمایہ داری کی مخالفت کی جدوجہد نہیں بلکہ سرمایہ دارانہ حقوق کے حصول کی جدوجہد میں ضم ہورہی ہے۔

عیسائی قیادت نے انیسویں صدی کے بعد یورپ میں اور دورِ حاضر میں لاطینی امریکا میں یہی رویہ اختیار کیا ہے بہت سے پادری سوشل رفارمر (Social Reformer) بن گئے اور عیسائی تعلیمات کی سماجی اصلاحی (Social Reformist) تاویلات پیش کی جانے لگیں۔ لیکن اس تجربہ سے ثابت ہوگیا کہ ان یکجہتی پوسٹ ماڈرنسٹ (New Social Movements) سے تعاون کے نتیجہ میں مذہبی شناخت کو فوقیت نہیں ملتی۔ کوئی اغلام باز، فیمینسٹ (Feminist) ماحولیاتی (Environmentalist) عیسائی نہیں بنتا بلکہ عیسائی نوجوان اغلام بازی Feminism اور Environmentalist آدرشوں سے متاثر ہوکر مذہبیت سے دور ہوتے چلے جاتے

ہیں۔

خطرہ اس بات کا ہے کہ New Social Movements سے اشتراکِ عمل کے نتیجہ میں مسلمان نوجوان بھی اغلام باز Environmentalist، امن پرست (Pacifist) اور Feminist بن جائیں گے اور اسلامی مذہبی آدرشیں ان کے لیے بے معنی ہو جائیں گی (سوشل ریفارم (Social Reform) کا کام ایک دو دھاری تلوار ہے۔ اگر انقلابی عمل سے مربوط ہو جائے تو معاشرتی ادارتی صف بندی میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ اگر سرمایہ دارانہ ریاستی تناظر میں کیا جائے تو انقلابی عمل کی بیخ کنی کر دیتا ہے)۔ یورپ میں ہماری کامیابی اس بات پر منحصر ہے کہ ہم کس رفتار سے ایک عام یورپی باشندے کو مسلمان بناتے ہیں۔ اس بات کو فرانس کی زیرِ زمین اسلامی تحریک کے مرشد، شیخ ابو بکر گاغودی (۱۹۵۰ء دہائی میں آپ فرنچ کمیونسٹ پارٹی (PCF) کے جنرل سیکرٹری اور Foucault کے قریبی ساتھی تھے۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں مشرف بہ اسلام ہوئے اور درقاویہ سلسلہ کے شیخ مقرر ہوئے۔ فرانس سے آپ نے تحریک برپا فرمائی) خوب جانتے ہیں اور آپ کی مساعیٔ جمیلہ کے نتیجہ میں آج فرانس کی اسلامی تحریکات (New Social Movements) کی تردید میں سب سے نمایاں معاشرتی قوت بن گئی ہیں۔ انہوں نے فرانس کے مسلم عوام کو گوناں (Gunan) اور شواں (Schuan) کے ملحدانہ تصوف (جو وحدتِ ادیان کا پرچار کرتی ہے اور اسلام، ہندومت اور بدھ مت کا ملغوبہ ہے) سے محفوظ رکھا اور توحیدی عیسائیوں (Cathars and Unitarians) کو اسلام سے متعارف کروایا (شیخ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ عیسائیت اسلام کی نامکمل اور مسخ شدہ تصویر کے علاوہ کچھ نہیں۔ حضرت عیسیٰ کے حواری مسلمان تھے اور پہلی اور دوسری صدی عیسوی میں بڑی تعداد میں عیسیٰ علیہ سلام کے مبلغین موحدین یعنی مسلمان ہی تھے۔ اسلام یورپ کا ورثہ ہے۔) اور عالمی اسلامی جہاد کے پرجوش حامی پورے فرانس میں پیدا کیے۔ فرانس، سوئزرلینڈ اور اسپین میں عوام کی سطح پر دعوتِ اسلامی سوشل ریفارم یا کمیونٹی کے حقوق کی جدوجہد میں ضم نہیں ہوئی۔

مسلم دنیا میں Postmodernism کا سب سے اہم اظہار Pragmatism کی مقبولیت ہے۔ Pragmatism اس رویہ کو کہتے ہیں جو عمل کا جواز اس کے نتیجہ کو سمجھتا ہے اور نتیجہ سے مراد دنیاوی بقا (Survival) ہے۔ Dewey کہتا ہے کہ حق inquiry ہے یعنی وہ عمل جس کے ذریعہ ایک حامی ماحول میں اپنے مفادات کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔ اور ''مفاد'' دنیا میں بقا ہے اور بقا کا انحصار قوت کی اجتماع پر ہے۔ Dewey بھی قوت کا پجاری ہے۔

Pragmatism کا اثر جماعتِ اسلامی کی پالیسی سازی پر نہایت نمایاں ہے اور Pragmatism کے سب سے اہم وکیل پروفیسر خورشید احمد ہیں۔ اس کی ایک ناقابلِ تردید مثال تو جماعتِ اسلامی کا چین اور سعودی عرب سے قریبی بڑھتا ہوا تعلق ہے۔ جماعتِ اسلامی کی چین اور سعودی عرب کی حمایت اور ان ممالک سے تعاون خالص Pragmatic بنیادوں پر ہے۔ چین کی حمایت اس لیے کرتی ہے کہ وہ پاکستان میں امریکی اثرات کو چیلنج کرنے والی واحد علاقائی قوت ہے جو ایک مسلم قوم پرست حکومت کی ممکنہ پشت پناہ بن سکتی ہے۔ سعودی عرب سے تعاون اس لیے کرتی ہے کہ سعودی مالی اور انتظامی تعاون کے بغیر جماعت کا یورپ اور امریکا میں کام کرنے والی برادر تنظیموں، اسلامک فاؤنڈیشن، اسلامک مشن یوکے اور ایکنا (ICNA) کو اس تعاون کی اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لیے ضرورت ہے۔

Pragmatism کے نفوذ کے نتیجہ میں جماعت فکری جمود کا شکار ہو گئی ہے۔ مولانا مودودی کی فکر کی جو تنقید شوریٰ اجلاسوں میں ۱۹۴۰ء کی دہائی سے آج تک مستقل ہو رہی ہے، وہ اب اخفا ہے۔ نصف صدی سے زیادہ عرصے سے ''روداد جماعت اسلامی (شوریٰ کے اجلاس کی کارروائی کی رپورٹ) نہیں چھاپی گئی۔ مولانا مودودی پر علماء کی اصولی تنقید کو ہمیشہ نظر انداز کیا جاتا ہے اور کسی اعتراض کا جواب نہیں دیا جاتا۔

اور جماعت کی قیادت اس رویہ کا خالصتاً Pragmatic جواز پیش کرتی ہے۔ اگر شوریٰ میں آرا کے اختلافات کو عام کیا گیا، اگر مولانا مودودی کی فکر کو متنازع تسلیم کیا گیا اگر جماعت کے تاریخی تجربات کا موضوع زیرِ بحث لایا گیا تو قیادت کہتی ہے کہ کارکنان میں Confusion پھیلے گا۔ نظمِ جماعت منتشر ہوگا اور جماعت کا وجود خطرہ میں پڑ جائے گا۔ لیکن جیسے کہ مولانا اصلاحی نے ۱۹۵۷ء اور ۱۹۶۶ء میں سوال اٹھایا تھا، اپنے جماعتی وجود کے دوام کو مقدم رکھنے کا کیا شرعی جواز ہے۔ جماعتِ اسلامی کس لیے قائم ہوئی؟ Pragmatic رویہ سے جو جواب اخذ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ''جماعت صرف اپنے قائم رہنے کے لیے قائم ہوئی'' لیکن یہ بات بالکل غلط ہے۔ جماعت اسلامی غلبۂ دین کے لیے قائم ہوئی اپنے قائم رہنے کے لیے قائم نہیں ہوئی۔ غلبۂ دین کی جدوجہد جماعتِ اسلامی کے قیام سے تقریباً ۱۴ سو سال پہلے سے جاری رہی ہے۔ جماعتِ اسلامی اس جدوجہد کو جاری رکھنے کا ذریعہ بن سکتی ہے لیکن غلبۂ دین کی جدوجہد کو جاری رکھنے کے لیے جماعتِ اسلامی کا وجود ضروری نہیں۔

سوال یہ نہیں کہ جماعتِ اسلامی کے وجود کو ابدی کیسے بنایا جائے (ابدی صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ غلبۂ دین کی جدوجہد بھی ابدی نہیں۔ وہ بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دوبارہ وارد اور انتقال کے بعد ختم ہو جائے گی)۔ سوال یہ ہے کہ جماعتِ اسلامی غلبۂ دین کو مہمیز کرنے کے لیے کیا کر رہی ہے اور کیا کر سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا مودودی کی سیاسی فکر کی بنیاد پر جماعتِ اسلامی نے جو پالیسی سازی کی ہے اس کا اثر محدود سے محدود تر ہوتا جا رہا ہے۔ وہ سرمایہ دارانہ نظامِ اقتدار کا حصہ بنتی چلی جا رہی ہے۔ اس کے کارکنوں کے معاشی مقاصد سرمایہ دارانہ نظام سے منسلک ہوتے جا رہے ہیں۔ جماعت کے پاس معاشرتی اور ادارتی صف بندی کا کوئی تصور موجود نہیں۔ مولانا مودودی کی فکر کی بنیاد پر اسلامی انقلابی ریاستی نظام قائم نہیں کیا جا سکتا صرف ترکی اور مصر جیسی اسلامی حکومتیں قائم کی جا سکتی ہیں جو سرمایہ دارانہ استعمار سے سمجھوتے کرنے پر ہمہ وقت مجبور ہیں (اخوانِ مصر بھی اپنے اسرائیل سے تعلقات کو جاری رکھنے کی Pragmatic جواز پیش کرتی ہے) اگر جماعتِ اسلامی کو غلبۂ دین کی جدوجہد میں ایک اہم کردار ادا کرنا ہے تو مولانا مودودی کی سیاسی فکر کو بھی رد کرنا ہوگا اور اپنے تعلیمی ڈھانچہ کو بھی۔ مولانا مودودی کی سیاسی فکر لاک (Lock) اور جیفرسن (Jefferson) سے ماخوذ ہے امام ماوردی، امام ابن خلدون اور شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ اجمعین کی فکر سے ماخوذ نہیں۔ اس سیاسی فکر کی بنیاد پر اسلامی نظاماتی اقتدار مرتب نہیں

کیا جا سکتا جماعتِ اسلامی کا تنظیمی ڈھانچہ دستوریت اور جمہوریت کا اسیر ہے اور اس نے نہ صوفیاء کی جماعتوں اور نہ مجاہدین کی جماعتوں کی صف بندی سے استفادہ کیا ہے۔ پھر یہ مسلم عوام کو اپنے اردگرد کیسے اکٹھا کر سکتی ہے۔

Post Modernism کی دوسری خصوصیات کا اثر مسلم دنیا کی اسلامی تحریکات پر بہت محدود ہے۔ بحیثیتِ مجموعی اسلامی گروہ نہ Modernist مباحث کو سمجھتے ہیں نہ ان کو رد کرنے کی ضرورت کے قائل ہیں۔ وہ سرمایہ دار نظاماتی صف بندی اور اس کی علمیت یعنی سائنس اور سوشل سائنس کو ایک غیر اقداری (Value less) تکنیکی حقیقت کے طور پر قبول کیے ہوئے ہیں۔ وہ سرمایہ داری کے علمی اور عملی غلبہ کو چیلنج نہیں کرتے۔ وہ اس کی Modernist اور Post Modrenist توجیہات سے ناواقف بھی ہیں اور ناواقف رہنا بھی چاہتے ہیں۔ یہ تحریکات تحفظِ دین اور غلبۂ دین کے لیے ایک نہایت مضر اور خطرناک رویہ ہے۔

لبرل سرمایہ دارانہ ریاست۔۔۔۔ حقیقت و ماہیت

دورِ حاضر میں جو ریاستی نظم دنیا پر مسلط ہے وہ سرمایہ دارانہ نظمِ اقتدار ہے اور اس کے استحکام اور توسیع سے اسلامی انفرادیت، معاشرت اور ریاست شدید خطرات سے دوچار ہے کیونکہ سرمایہ دارانہ اقتدار کی موجودگی میں مذہبی اقدار کا تادیر قائم رکھنا نہایت مشکل امر ہے۔ مغرب میں عیسائی اقدار کی تباہی اس کا واضح تاریخی ثبوت ہے۔ نفسِ مضمون یعنی سرمایہ دارانہ ریاست کی حقیقت و ماہیت بیان کرنے سے قبل ہم چند اصولی تمہیدی نکات پیش کرنا چاہتے ہیں جن سے ریاستی معاملات پر انقلابی نقطہ نظر اختیار کرنے کی اہمیت واضح ہوگی۔

اولاً: خلافت یعنی شریعتِ محمدی کی پابند ریاست کے قیام کے بغیر نہ تو اسلام کو قوت اور غلبہ حاصل ہوسکتا ہے اور نہ ہی طاغوتی نظام کا خاتمہ ممکن ہے۔ شریعت کا مسلمہ اصول ہے کہ واجب کا مقدمہ بھی واجب ہوتا ہے، لہٰذا ریاست اسلامیہ کے قیام کیلئے جو ذرائع ناگزیر ہیں ان کے حصول کی کوشش کرنا مسلمانوں پر واجب ہے۔

ثانیاً: ۱۸۵۷ء کے جہاد میں ناکامی اور خلافتِ عثمانیہ کے سقوط کے بعد سے لے کر اب تک سرمایہ دارانہ استعمار کے جواب میں احیائے اسلام کیلئے بے شمار تحریکات برپا ہوئیں جن کے کام کو تقسیمِ کار کے اعتبار سے چار سطحوں پر رکھا جا سکتا ہے:

۱۔ مدرسین اور مزکین:

ان کا بنیادی ہدف اسلامی علوم کا تحفظ اور اسلامی انفرادیت و تشخص کا فروغ ہے۔ ان کے بنیادی ادارے مسجد، مدرسہ اور خانقاہ ہیں۔

۲۔ مبلغین اور مصلحین:

ان کا بنیادی مقصد اسلامی معاشرت کا استحکام و فروغ ہے اور وہ دینی تہذیبی روایات کے تحفظ و فروغ اور حلال کاروبار کے پھیلاؤ میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ اس ضمن میں سب سے نمایاں کام تبلیغی جماعت اور دعوت اسلامی کا ہے جو صحیح معنی میں عوامی اسلامی تحریکات ہیں۔

۳۔ انقلابی:

ان کا نقطۂ ماسکہ ریاست کی اسلامی نہج پر اصلاح و قیام ہے اور یہ رائج شدہ نظامِ زندگی میں مکمل تبدیلی کے خواہاں ہیں۔

۴۔ مجاہدین:

ان کا مرکزی نکتہ بھی تعمیر وغلبۂ اسلامی ریاست ہے اور یہ استعمار اور اس کے ایجنٹوں سے عسکری سطح پر برسرِ پیکار ہیں اور طاغوتی طاقتوں کے پھیلاؤ کے مدِمقابل مزاحمت پیدا کر کے اسلامی ریاستوں کے قیام کے مواقع فراہم کر رہے ہیں۔اس کی سب سے واضح مثال طالبان عالیشان ہیں۔

اول الذکر دو تحریکات دفاعِ امت جبکہ موخر الذکر دونوں غلبۂ دین کی تحریکات ہیں۔ یہ تمام راسخ العقیدہ دینی گروہ پورے اخلاص کے ساتھ اپنے اپنے کام میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ البتہ ان کے کاموں میں ایک بنیادی کمزوری یہ ہے کہ ان کے کام اس معنی میں جدا جدا ہو گئے ہیں کہ تطہیرِ نفس اور اصلاحِ معاشرہ کا کام وہ علماء وصوفیہ اور جماعتیں کر رہی ہیں جو تعمیرِ ریاست کے کام سے لاتعلق ہیں، اسی طرح تعمیرِ ریاست اور جہاد کا کام وہ جماعتیں کر رہی ہیں جن کے پاس بالعموم تطہیرِ قلب کا کوئی واضح ضابطہ موجود نہیں ہے۔ نتیجتاً تطہیرِ قلب کا کام محض تبلیغ وتطہیر اور ریاست کا کام محض قتال یا جمہوری عمل بن کر رہ گیا ہے۔ تقریباً ہر اسلامی گروہ اور جماعت اپنے کام کو دوسرے اسلامی گروہ کے کام کا متبادل (substitute) اور اس سے اعلیٰ و ارفع سمجھتی ہے جبکہ حقیقتاً ان کے درمیان تعلق ایک دوسرے کے تکمیلے (complementarity) کا ہے اور ان چاروں میں سے کسی دینی کام کو دوسرے دینی کام پر کوئی اقداری فوقیت حاصل نہیں۔ اصل ضرورت کسی نئے دینی کام کو شروع کرنے یا ایک دینی کام کو چھوڑ کر کسی دوسری دینی جماعت میں ضم ہو جانے یا کوئی ایسی نئی دینی جماعت بنانے کی نہیں جو سب کام کرے کیونکہ الحمدللہ مختلف انفرادی دینی جماعتوں کا کام مل کر مطلوبہ مجموعی دینی کام کی کفایت کرتا ہے۔ اصل ضرورت موجودہ دینی تحریکات کے کام میں ارتباط پیدا کرنے کی ہے۔ ہر دینی گروہ اس بات کو لازم پکڑے کہ اپنے کارکنان کو دوسری دینی تحریکات کا قدردان بنائے اور ان کے ساتھ اشتراکِ عمل کرنے پر رغبت دلائے۔ جب تک اسلامی گروہوں میں اشتراکِ عمل کا یہ طرزِ فکر عام نہ ہوگا، دوسرے گروہ کے دینی کام کو برابر اہمیت نہ دی جائے گی اور مجموعی کام کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط نہیں کیا جائے گا، انقلابی جدوجہد کا سہ جہتی (three dimensional) کام ادھورا ہی رہے گا۔

کہو ہر کارکن سے سب جتھوں کو اپنا گھر سمجھے
ہر ایک بھائی کو اپنا حلیف وہمسفر سمجھے (مولانا معین الدین خٹک)

ثالثاً: ان تحریکات کی جدوجہد بالعموم سرمایہ دارانہ نظام کے اندر رہتے ہوئے مرتب ہوتی ہے اور ان کے پاس ریاست کے اندر ریاست (state within the state) قائم کرنے کا کوئی لائحہ عمل موجود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اتنے بڑے پیمانے پر جاری وساری کام کے باوجود اسلامی قوت یکجا نہیں ہو رہی اور ان غیر مجتمع انفرادی دینی کاموں کے نتیجے میں غلبۂ دین کے امکانات سامنے نہیں آتے اور نہ ہی تحفظِ دین کا کام کماحقہ ہو پاتا ہے کیونکہ ہم ہمیشہ دفاع اور ردعمل کی سطح ہی پر رہتے ہیں۔ موجودہ ریاستی ڈھانچے کے حوالے سے اسلامی تحریکات کے رویوں میں دو طرح کی خامیاں ہیں، ایک وہ جو تحفظِ امت کی تحریکات کو لاحق ہیں اور دوم وہ جن کا شکار غلبۂ دین کی تحریکات ہیں:

(الف) اصلاحِ انفرادیت ومعاشرہ کی تحریکات اصولاً تحفظِ اسلام کی تحریکات ہیں جن کا مقصد سرمایہ دارانہ نظمِ اجتماعی کے اندر ایک ایسے دائرے کی تلاش رہی ہے جہاں اسلامیت کی حفاظت وبقا ممکن ہو سکے۔ ان تحریکات نے اس مفروضے کی بنیاد پر خود کو ریاستی معاملات سے علیحدہ رکھا ہے کہ نظامِ اقتدار سے غیر جانبداری کا رویہ ممکن ہے جبکہ یہ مفروضہ درست نہیں۔ ریاست سے غیر جانبداری ناممکن الوقوع شے ہے کیونکہ ریاست تو بالفعل 'موجود ہے' اور وہ احکام کے صدور کے ذریعے فرد اور معاشرے پر اثر انداز ہوتی رہتی ہے۔ چنانچہ اقتدار کے معاملے میں لاتعلقی یا غیر جانب دار رویے کی کوئی حقیقت نہیں۔ یا تو آپ کسی نظامِ اقتدار کے خلاف ہوتے ہیں یا اس کے حق میں۔ ان کے درمیان کوئی راستہ موجود نہیں۔ ہماری سب سے بڑی عوامی تحریکات یعنی دعوتِ اسلامی اور تبلیغی جماعت ریاستی مسائل سے نہ صرف یہ کہ صرفِ نظر کرتی ہیں بلکہ انہیں گندگی سمجھتی ہیں۔ یہ جماعتیں اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ غیر سیاسی جماعتیں ہیں حالانکہ ان کی اس بات کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ انہوں نے باطل نظامِ اقتدار سے مصالحت قبول کر لی ہے۔ اقتدار سے لاتعلقی کے امکان کی اس غلط فہمی کا نتیجہ یہ ہے کہ اسلام پر عمل کرنے کا دائرہ دن بدن چھوٹا ہوتا چلا جا رہا ہے اور سرمایہ داری پر مبنی نظامِ اقتدار ہم پر غالب آتا جا رہا ہے۔ کسی منکر کو ہوتے دیکھ کر خاموش رہنے کا مطلب یہ نہیں کہ آپ منکر کے معاملے میں غیر جانبدار ہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اس کی بالادستی قبول کرتے ہیں اور منکر کے ساتھ یہ مفاہمت اس کی تقویت اور فروغ کا باعث بنتی ہے۔ لہٰذا اقتدار (نہ کہ محض حکومت) اور غلبے کے مسئلے پر تمام دینی کام کو مربوط کرنے کی سخت ضرورت ہے کہ اگر یہ نہ کیا گیا تو انفرادی اصلاح تو ہو جائے گی لیکن اس کے نتیجے میں کافر اقتدار کو نقصان نہیں پہنچے گا اور بالآخر اصلاحِ نفوس بھی مشکل ہوتی چلی جائے گی کیونکہ اصلاح کتنی ممکن ہے اس کا انحصار واقعیت (Facticity) کی ان معاشرتی وریاستی جکڑ بندیوں پر ہوتا ہے جن سے ایک فرد دوچار ہوتا ہے۔ اسلامی انفرادیت کے فروغ کیلئے ایسی ترتیبِ اقتدار چاہیئے جو واقعیت کو بدل دے اور اسلامی انفرادیت کی راہ میں حائل رکاوٹیں دور کر دے۔ مصلحانہ جدوجہد کرنے والی تحریکات کا یہ مفروضہ غلط ہے کہ اسلامی انفرادیت کا سیاسی اظہار اور ترتیب اقتدار خود بخود رونما ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے جب اسلامی علمیت کے تحفظ کیلئے شعوری طور پر ادارتی صف بندی عمل میں لانا لازم ہے محض افراد کو اس کی اہمیت بتلا دینے سے کام نہیں چلتا تو اسلامی اقتدار کے قیام کیلئے مطلوبہ صف بندی سے صرفِ نظر کیسے کیا جا سکتا ہے اور اس کا ظہور خود بخود کیسے ہو جائے گا؟ افسوس کی بات ہے کہ ہمارے مدارس میں بھی ریاست و سلطنت کی نظریاتی بحثیں بالکل معدوم ہو گئی ہیں اور متقدمین میں سے کسی مسلم سیاسی مفکر کی کوئی کتاب ہمارے درسِ نظامی میں شامل نہیں۔

(ب) انقلابیوں کا اصل کام یہی ہے کہ وہ سارے دینی کام کو اس طرح مجتمع کریں کہ اسلامی اقتدار قائم ہو سکے۔ مگر جن تحریکات نے غلبۂ دین کو اپنی جدوجہد کا بنیادی مرکز بنایا انہوں نے یا تو انقلاب کو جمہوری سیاست کا ہم معنی سمجھ لیا یا پھر احتجاجی ومطالباتی سیاست کو۔ یاد رہنا چاہیئے کہ ہماری جدوجہد کا مقصد موجودہ نظامِ اقتدار کے اندر شمولیت نہیں بلکہ ایک متبادل نظامِ زندگی اور اقتدار قائم کرنا ہے جہاں عوام یا کسی فرد کے بجائے 'اہل الرائے' کا اقتدار قائم ہو جن کی مرضی ومشورے سے ہی ریاست کے امور طے پائیں۔ جن تحریکات نے جمہوری سیاست کو اصل مقصود بنا رکھا ہے انہیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ ریاست کے اندر ریاست (state within the state) کے قیام کی جدوجہد کے بغیر ریاست نہیں بلکہ حکومتیں تبدیل ہوا کرتی ہیں کیونکہ قانون کے اندر رہ کر کی جانے والی جدوجہد تو loyal disobedience (تابعدارانہ مخلص نافرمانی) ہوتی ہے جس کے نتیجے میں نظامِ اقتدار تبدیل نہیں ہوتے۔ نظامِ باطل کے قانونی دائرے میں رہتے ہوئے اقتدار تبدیل کرنے کی خواہش رکھنا self-defeating (تضاد پر مبنی) اصول ہے کیونکہ ہر نظامِ

اقتدار کے قوانین اس کے اپنے استحکام کیلئے بنائے جاتے ہیں نہ کہ اسے ڈھا دینے کے لئے۔ Loyal disobedience کے ذریعے اقتدار تبدیل کرنے کی غلط فہمی اس لئے پیدا ہوئی کہ ہم نے قانون کو 'غیر اقداری' (value-neutral) سمجھ لیا ہے حالانکہ ہر قانون ایک مخصوص انفرادیت و معاشرت نافذ کرنے کیلئے وضع کیا جاتا ہے اور یہی حال ہیومن رائٹس پر مبنی دستوری قانون کا بھی ہے جس کا مقصد سرمایہ دارانہ شخصیت (ہیومن)، معاشرت (سول سوسائٹی) اور ریاست (ریپبلک) کا قیام و فروغ ہے۔ جو تحریکات خود کو اصولاً اور عملاً انقلابی کہتی ہیں ان کے پاس بھی انقلابی عمل کا کوئی واضح لائحہ عمل موجود نہیں۔ انکے انقلاب کا تصور بس یہ ہے کہ بہت سے لوگوں کو کسی دعوت کے تحت منظّم کر کے حکومتِ وقت سے بھڑ جاؤ یا اس سے چند مطالبات تسلیم کرالو۔ ظاہر ہے یہ تصور غلط ہے کیونکہ انقلابی عمل کا مطلب ہوتا ہے قوتِ نافذہ کو موجودہ افراد اور اداروں سے چھین کر متبادل افراد اور ادارتی صف بندی کے تحت مربوط اور مجتمع کرنا۔ انقلابی تحریکات اس قسم کی سعی پر کوئی توجہ نہیں دیتیں کیونکہ وہ حکومت اور ریاست کے فرق کو سمجھ نہ سکیں۔ بہت سی انقلابی تحریکات ریاستی قوت کے متبادل ادارے قائم کرنے کو ناجائز گردانتی ہیں گویا وہ ریاست کے اندر ریاست قائم کئے بغیر انقلاب لانے کا خواب دیکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اصلاحی جماعتوں کی مانند انقلابی جماعتیں بھی تحریکِ لال مسجد کی انقلابی حکمتِ عملی کو غلط قرار دیتی رہیں۔ یاد رکھنا چاہئے کہ تاریخ میں کوئی انقلاب محض دعوت و تبلیغ کے زور پر نہیں آیا بلکہ اس کے لئے لازماً قوت کو غالب نظامِ اقتدار کے خلاف جمع کرنا پڑتا ہے۔ اگر سیاسی جدوجہد کے نتیجے میں محض حکومتی افراد تبدیل ہو جائیں مگر اقتدار کا مرکز موجودہ ادارے ہی رہیں تو اس جدوجہد سے کوئی با معنی تبدیلی نہیں ہو پاتی۔ وہ لوگ جو انقلابی عمل کی حقیقت اور حکومت و ریاست کے فرق کو نہیں پہچانتے وہ مجاہدین کی جدوجہد کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ وہ کبھی مجاہدین کے اقدام کو غم و غصے کا اظہار کہتے ہیں اور کبھی شدت پسندانہ رویے پر مبنی ردعمل۔ ایسے لوگ مجاہدین کی جدوجہد کو عالمی قوانین کی پاسداری کرنے کے حوالے سے شرع کی تعلیمات کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں...... **فیا للعجب**

رابعاً: یہ سمجھ لینا چاہئے کہ دورِ حاضر میں قائم اکثر و بیشتر مسلم ریاستیں کافرانہ نظمِ اجتماعی پر قائم ہیں گو انہیں چلانے والے مسلمان ہیں، اور ان ریاستوں کا خلافت ہونا تو کجا سلطنتِ اسلامیہ کے درجے سے بھی دور کا واسطہ نہیں کیونکہ یہ تمام ریاستیں قومی ہیں جہاں حاکمیت کی بنیاد عوامی نمائندگی ہے، جہاں علومِ شرعیہ کے بجائے سوشل سائنسز کی بالادستی ہے، جہاں شرع کے بجائے دستوری قانون نافذ ہے وغیرہ۔ انقلابیوں کا بنیادی مقدمہ یہی ہے کہ تحفظ اور غلبۂ اسلامی کا کام اسی وجہ سے انتشار کا شکار ہے کہ وہ اسلامی ریاست جو تسلسل کے ساتھ سلطان عبدالحمید ثانیؒ کے دور تک قائم تھی اور جس نے تمام دینی کام کو سمیٹ رکھا تھا اب مفقود ہو گئی ہے۔ سلطان اسی معنی میں ظل اللہ تھا کہ اس کی برکت سے تمام دینی کام مربوط تھے اور اقتدار کی کنجیاں علماء اور صوفیہ کے ہاتھوں میں محفوظ تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ مجدد الف ثانی رحمہ اللہ اور شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے مغل سلطنت کے استحکام کی کوششیں کیں (ماسوائے اکبر کی حکومت کہ اس نے دینِ الٰہی کو فروغ دینے کی کوشش کی)۔ لہذا ضروری ہے کہ ہم یہ سمجھیں کہ باطل نظامِ اقتدار کے اندر غلبہ دین کی کوشش بار آور نہیں ہو سکتی اور اسلامی ریاست قائم کرنا ضروری ہے۔

درجِ بالا جدوجہد مرتب کرنے کیلئے یہ سمجھنا لازم ہے کہ جس ریاستی نظم سے ہمارا مقابلہ ہے اس کی نوعیت کیا ہے اور یہ ریاست کس طرح کام کرتی ہے کیونکہ ان اصولی مباحث کو سمجھنے کے بعد ہی ہم یہ سوال اٹھا سکیں گے کہ کس طرح اسلامی ریاست قائم اور مستحکم کرنے کی جدوجہد کی جا سکتی ہے۔ اس مضمون میں پیش کردہ لبرل سرمایہ دارانہ ریاست کا عمومی خاکہ دو سوالات کے جوابات دینے کی کوشش کرتا ہے۔ اولاً سرمایہ دارانہ اقتدار کس کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور دوم یہ اقتدار کیسے قائم رکھا جاتا ہے۔ زیرِ نظر مضمون سے یہ بات بھی واضح ہوگی کہ حکومت اور ریاست (نظامِ اقتدار) میں بہت فرق ہوتا ہے۔ حکومت محض ریاست کا ایک جزو ہے۔

ریاستی سطح پر سرمایہ دارانہ اقتدار کس طرح تشکیل پاتا ہے؟

فرماں روائی اور عملداری کس کی ہوتی ہے:

معاشرہ رضا کارانہ (voluntary) صف بندی سے تشکیل پاتا ہے یعنی افراد اپنی مرضی سے تعلقات استوار کرتے ہیں۔ اس کے برعکس ریاست نظامِ اقتدار کا نام ہے یعنی ایک جبری صف بندی کی تشکیل کی جاتی ہے۔ اب سب سے بنیادی سوال یہی ہے کہ لبرل سرمایہ دارانہ ریاست میں اصل اقتدار کس کو حاصل ہوتا ہے۔ لبرل سرمایہ دارانہ ریاست میں اصل اقتدار ان کو حاصل ہوتا ہے جو سرمایہ دارانہ عقلیت پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کے مؤید ہوتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ عقلیت کا تقاضا ہے کہ انسان کو تمتع فی الارض کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کیے جائیں۔ انسان کو اپنی خواہشات کی تکمیل کے زیادہ سے زیادہ مساوی مواقع ملیں، تو جو لوگ سرمایہ دارانہ لبرل ریاست میں صاحبِ اقتدار ہوتے ہیں، وہ اسی سرمایہ دارانہ عقلیت کے بارے میں راسخ العقیدہ ہوتے ہیں اور یہی اُن کے اقتدار کا جواز ہیں۔

فرماں روائی اور عملداری کیسے کی جاتی ہے:

اب بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سرمایہ دارانہ عقلیت پر ایمان رکھنے والوں کا اقتدار کیسے قائم ہوتا ہے اور کیسے مستحکم ہوتا ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب پورا معاشرہ سرمایہ دارانہ تعقل کو اصل عقلیت کے طور پر قبول کر لے۔ سرمایہ دارانہ عقلیت کی بنیاد پر ہی تمام یا زیادہ سے زیادہ فیصلے ہوں، گویا سرمایہ دارانہ عقلیت کو آفاقی بنا کر اقتدار کو مستحکم کیا جاتا ہے۔ جس قدر اس سرمایہ دارانہ عقلیت کی توسیع ہوگی، جس قدر سرمایہ دارانہ عقلیت کو معاشرہ میں قبولیتِ عامہ حاصل ہوتی جائے گی، جتنا سرمایہ دارانہ عقلیت پر ایمان رکھنے والے اور سرمایہ دارانہ عقلیت کے داعی اس میں کامیاب ہوں گے، اتنا ہی ان کا اقتدار مستحکم ہوگا۔

ریاستی اقتدار:

معاشرہ کے برعکس کہ جہاں تعلقات رضا کارانہ بنیادوں پر استوار ہوتے ہیں ریاست ایک نظامِ اقتدار کا نام ہے جس کے پاس اپنے فیصلوں کے نفاذ کے لیے ایک مخصوص علاقہ اور اس کی آبادی کے لیے قوتِ نافذہ بھی موجود ہوتی ہے گویا سرمایہ دارانہ عقلیت پر ایمان رکھنے والوں کے پاس محض تحکم نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے فیصلوں کے نفاذ کے لیے ریاست کی قوت کو استعمال کرتے ہیں۔

سرمایہ دارانہ لبرل ریاست میں دو مختلف طریقوں سے نظامِ اقتدار مرتب کیا جاتا ہے یعنی اس کے دو مختلف ڈھانچے ہوتے ہیں: ۱۔ جمہوری طریقہ ۲۔ لبرل ڈکٹیٹر شپ یا آمریت

بظاہر ان دونوں طرز ہائے اقتدار کی ترتیب و تنظیم مختلف ہوتی ہے لیکن عملاً ان دونوں کے نتیجے میں سرمایہ دارانہ عقلیت ہی غالب آتی ہے، یعنی یہ دو قالب ہیں لیکن ان دونوں کی روح ''سرمایہ دارانہ عقلیت'' ہی ہے۔ ان دونوں طرزِ اقتدار کو استعمال کر کے سرمایہ دارانہ عقلیت ہی کو آفاقی بنایا جاتا ہے اور ان بظاہر دو مختلف طرزِ اقتدار میں فیصلے سرمایہ دارانہ عقلیت کی بنیاد پر ہی کیے جاتے ہیں اور اسی کو مقبول عام بنائے جانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

پاکستان کے تناظر میں دینی جماعتوں کی توجہ ''سرمایہ دارانہ عقلیت'' کی مرکزی بحث کے بجائے اس کے قالب یعنی آمریت اور جمہوریت پر مرکوز ہوگئی ہے۔ پاکستان میں دینی جماعتیں سمجھتی ہیں کہ ان کو جمہوری طرز کی حکومت میں اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کی زیادہ آزادی میسر آتی ہے (گوکہ ان پر یہ بھی الزام عائد کیا جاتا ہے کہ ان کو زیادہ فائدہ آمریت کی حکومتوں نے پہنچایا ہے) لیکن ان کو یہ سمجھنا چاہیے کہ جمہوریت یا آمریت میں روح ایک ہی کارفرما ہے، اور ان کے متبادل کی بجائے انہی دونوں میں گنجائشیں تلاش کرنے سے ان دونوں نظاموں ہی کو استحکام حاصل ہوتا ہے۔ گنجائش تلاش کرنے سے یہ دونوں نظام کمزور نہیں ہوتے یا ان کو پیچھے نہیں دھکیلا جا سکتا۔

فرماں روائی کا طریقۂ عمل اور اس کے دو مختلف تصورات:

فرماں روائی کے طریقۂ عمل (Governance process) سے مراد ہے کہ کس طریقے سے احکام صادر کیے جارہے ہیں اور کس طریقے سے احکام نافذ کیے جارہے ہیں۔ نظامِ اقتدار کو مرتب کرنے کے لیے ضروری ہے کہ محض احکام دیئے نہ جارہے ہوں بلکہ ان کو نافذ کرنے کے لیے بھی پوری حکمت عملی اور مشینری موجود ہو۔ گویا طریقۂ عمل سے مراد سرمایہ دارانہ عقلیت کی آفاقیت اور اس کے غلبے کو ممکن بنانے کا مخصوص طریقۂ عمل ہے۔

اس سلسلے میں دو مختلف تصورات پائے جاتے ہیں:

☆ ایک تصور تو یہ ہے کہ ہر فرد فطرتاً یہی چاہتا ہے کہ تمتع فی الارض اور خواہشات کو پورا کرنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع میسر آئیں، یعنی معاشرہ اس بات پر راضی ہے اور معاشرے کے ہر فرد کی یہی خواہش ہے کہ سرمایہ دارانہ عقلیت پر ہی زندگی کے ہر شعبہ کے ہر دائرہ کار میں فیصلے کیے جائیں اور سرمایہ دارانہ عقلیت ہی کو غلبہ حاصل ہو۔ یہی وہ نقطۂ نگاہ ہے جو اٹھارویں صدی کے اندر Scottish enlightenment کے مفکروں اور کانٹ کی فکر میں ملتا ہے کہ فطرتِ انسانی کا تقاضا ہی یہ ہے کہ اس کی تمام خواہشات کی تسکین ہو۔ لہٰذا اسٹیٹ کو سوسائٹی پر تسلط کی ضرورت نہیں بلکہ ریاست معاشرے کے مختلف افراد جو خواہشات رکھتے ہیں انہی کو پورا اور نافذ کرنے کا معقول ترین طریقہ وضع کرتی ہے۔ گویا سرمایہ دارانہ لبرل ریاست سرمایہ دارانہ معاشرے کی خواہشات کو پورا کرنے کا ''ذریعہ'' ہوتی ہے، لہٰذا اصولاً وہ اس کے تابع ہوتی ہے۔

☆ دوسرا تصور یہ ہے کہ معاشرہ کے افراد نہیں جانتے کہ انہیں کیا چاہنا چاہیے۔ وہ عقلیت اصلیہ یعنی سرمایہ دارانہ عقلیت کے تقاضوں سے ناواقف ہوتے ہیں، لہٰذا ایک ایسے گروہ کی ضرورت ہے جو اصلی عقلیت کی نمائندہ ہو، یہی گروہ پوری انسانیت کا نمائندہ گروہ ہے۔ اس گروہ کی ذمہ داری ہے کہ آمریت قائم کر کے لوگوں کو مجبور کریں کہ اس اصلی عقلیت (سرمایہ دارانہ عقلیت) کے مطابق تمام فیصلے کئے جائیں۔ گویا ریاست محض معاشرے کے تابع نہیں ہے بلکہ اس کو معاشرے پر غالب ہونا چاہیے اور اس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ عقلیتِ اصلیہ کو معاشرتی سطح پر اور انفرادی سطح پر نافذ کرنے کے لیے نظامِ اقتدار کھڑا کرے۔ اب یہ گروہ کون سا ہے۔ اس کے بارے میں اختلاف ہوسکتا ہے (وہ مزدوروں کی آمریت یا مخصوص طبقہ یا قوم ہوسکتی ہے)

واضح رہے کہ یہ دونوں تصورات ونظریات ریاست کے اندر خواہشاتِ نفسانیہ کی زیادہ سے زیادہ تکمیل کی جدوجہد ہی کو جواز فراہم کرتے ہیں۔ ان کا طریقہ مختلف ہے۔ ایک طریقے میں ریاست معاشرہ کے ماتحت ہے اور ریاست ان خواہشات کو پورا کر رہی ہے جو معاشرے کی حرکیات Dynamic میں خود بخود ابھر کر سامنے آرہی ہیں اور ریاست ان کی ترتیب، تقدیم اور تاخیر کا ایک ذریعہ ہے۔ دوسرے طریقہ میں ریاست کو معاشرے پر غلبہ حاصل ہوتا ہے اور وہ یہ فیصلہ کرتی ہے کہ لوگوں کو کیا چاہنا چاہیے اور اس کے حصول کا بہترین طریقہ کیا ہے۔

سرمایہ دارانہ عقلیت کے نفاذ کے لیے تین بنیادی فرائض:

سرمایہ دارانہ عقلیت کے حاملین سرمایہ دارانہ نظامِ اقتدار کو معاشرتی سطح پر مرتب کرنے کی جو کوشش کرتے ہیں، اس کے لیے انہیں تین بنیادی فرائض ادا کرنے پڑتے ہیں۔

۱۔ مارکیٹ کے اندر واحد پیمانہ تعین قدر سرمائے کا عمل بن جائے۔

۲۔ سرمائے کی بڑھوتری کا تعقل پورے معاشرے پر حاوی ہوجائے اور زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہ رہے جو سرمایہ دارانہ عقلیت سے ماورا ہو۔

۳۔ نمبر 1 اور نمبر 2 کو قبولیتِ عامہ اور جوازِ عمومی حاصل ہوجائے۔

سرمایہ دارانہ عقلیت کو غالب کرنے کے لیے ضروری ہے کہ زندگی کے ہر دائرہ کار میں تمام اعمال کو اس واحد عمل کے اردگرد مجتمع کر دیا جائے، یعنی سرمائے کی بڑھوتری مستقل تیز ہوتی چلی جائے اور سرمائے کی بڑھوتری محض خود اپنا جواز ہو۔ ہر معاشرتی یا انفرادی عمل کا مقصدِ اولین (Ultimate end) یہی ہو، کیوں کہ سرمایہ (Capita) ہی ''آزادی'' (Freedom) کی مجسم شکل ہے۔

یہ عمل پہلے مارکیٹ کی سطح پر ہوتا ہے۔ جہاں اس کو واحد معقول پیمانۂ خیر وشر کے طور پر قبول کرلیا جاتا ہے اور کسی بھی عمل کو صرف اسی بنیاد پر جانچا جاتا ہے کہ اس مخصوص عمل کے نتیجے میں

سرمایہ کی بڑھوتری کی رفتار میں تیزی آرہی ہے یا کمی ہورہی ہے۔ یعنی فرد کے مخصوص عمل کے نتیجے میں سرمایہ کی بڑھوتری کی رفتار پر کیا فرق پڑ رہا ہے۔ اگر زید کی مخصوص نوکری کے نتیجے میں سرمائے کی بڑھوتری کی رفتار میں اس سے کم اضافہ ہوتا ہے جتنا ایک اسٹاک بروکر کی کاوش کے نتیجے میں ہوتا ہے تو معقول بات اور جائز یہی ہے کہ زید کی تنخواہ اسٹاک بروکر کے مقابلے میں کم ہو کیوں کہ سرمائے کی بڑھوتری کے عمل کو آگے بڑھانے میں زید کا حصہ (Contribution) اس سے کم ہے جو اسٹاک بروکر کا ہے۔ گویا مارکیٹ کی سطح پر جو معقول پیمانۂ خیر وشر مسلط ہوجاتا ہے اور جسے قبول کیا جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں ایک فرد کو تمتع فی الارض کی جو اجازت دی جاتی ہے وہ اس سے ہم آہنگ ہوتی ہے کہ وہ سرمائے کی بڑھوتری کے عمل کو کتنا مہمیز کرتا ہے۔

معاشرے کے اندر مارکیٹ ایک دائرہ کار ہے۔ مارکیٹ کے باہر بھی فرد بہت سے تعلقات کو تشکیل دیتا ہے اور یہ ضروری نہیں کہ وہ ان تعلقات کی تشکیل بھی سرمایہ دارانہ عقلیت یا بڑھوتریٔ سرمایہ کی بنیاد پر کرے، مثلاً خاندانی تعلقات عموماً ایثار ومحبت کی بنیاد پر تشکیل پاتے ہیں لیکن سرمایہ دارانہ اشرافیہ اور سرمایہ دارانہ عقلیت میں راسخ العقیدہ لوگوں کی کوشش ہوتی ہے کہ بڑھوتریٔ سرمایہ کا اصول (Principal of Capital accumlation) جو واحد معقول پیمانے کے طور پر مارکیٹ میں تسلیم کرلیا گیا ہے یہ صرف مارکیٹ تک محدود نہ رہے بلکہ آفاقی ہوجائے، خاندان بھی مارکیٹ کا حصہ ہوجائیں، افراد رشتۂ ازواج میں منسلک ہوتے ہوئے ایمانداری، نسب وشرافت، خاندان اور کفو کو اہمیت نہ دیں بلکہ کیریئر یا پیسہ کو مدّ نظر رکھیں۔ بچوں کی تربیت کرتے ہوئے بھی سرمایہ دارانہ تعقل کو نظر انداز نہ کریں۔ برادریاں' قبیلے' قوم اور حتیٰ کہ مذہبی ادارے بھی مارکیٹ کے اس تعقل کا حصہ بن جائیں۔ فرد صرف مارکیٹ کے عمل میں سرمائے کا ایجنٹ نہ ہو بلکہ زندگی کا ہر کردار نبھاتے ہوئے وہ سرمائے کا آلہ کار ہو، اس کو (Capitalist socialisation) کہتے ہیں اور جہاں اس قسم کی سرمایہ دارانہ انفرادیت مکمل طور پر عالمگیر ہوجاتی ہے، اس عمل کو سرمایہ دارانہ معاشرتی عمل یعنی Capitalist Socialization کہتے ہیں۔

یہ وہ عمل ہے جس کے نتیجے میں معاشرہ سرمایہ دارانہ خطوط پر استوار ہوتا ہے۔

تیسرا فرض یہی ہوتا ہے کہ یہ دونوں طرح کے فرائض محض زبردستی نافذ نہ کیے جا رہے ہوں بلکہ ان کو قبولیت عامہ اور جوازِ عمومی حاصل ہو۔ عام آدمی کے لیے یہی معقول پیمانۂ خیر و شر اور پیمانۂ عمل بن جائے، اور جب فرد کا ہر عمل بڑھوتریٔ سرمایہ کے تحت آ جائے تو فرد خود اپنے دل میں یہ محسوس کرے کہ میں کامیاب ہو گیا ہوں، اور زندگی کے ہر شعبے کے اندر سرمائے کی بڑھوتری کو مہمیز کرنے کی بنیاد پر اپنی مرضی سے اپنے اعمال کا تعین کرے۔ کسی معاشرے میں کس قدر سرمایہ دارانہ جبر کی ضرورت ہے اس بات کا انحصار اس بات پر ہے کہ افراد کتنے سرمایہ دار ہو چکے ہیں۔

سرمائے کی فرماں روائی اور عمل داری کو کن افراد کے ذریعے ممکن بنایا جاتا ہے

سرمایہ دارانہ عقلیت کوئی فطری چیز نہیں ہے بلکہ انتہائی غیر فطری چیز ہے، اس لیے سرمایہ دارانہ تعقل کو پورے نظامِ زندگی پر غالب کرنے کے لیے خصوصی کوشش کی جاتی ہے۔ اس میں مخصوص افراد اور اداروں کی اہمیت ہوتی ہے۔ پہلے ہم ان افراد کا تذکرہ کرتے ہیں جو سرمایہ دارانہ عقلیت کو قبولیتِ عامہ دلوانے اور سرمایہ دارانہ عقلیت کو غلبہ دلانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

(۱) دانشور Intellectual:

یہ وہ فرد ہے جو قدیم مذہبی علمیت اور قیادت کا فطری مخالف ہے۔ مذہبی علمیت کی بنیاد یہ ہوتی ہے کہ ہر عمل کی انجام دہی سے پہلے اللہ تعالیٰ کی رضامندی و مرضی تلاش کی جائے۔ احکامات کا استنباط اس طرح کیا جائے کہ اللہ کی مرضی و منشأ سے قریب تر ہونا ممکن ہو سکے اور اللہ تعالیٰ کی مرضی کی اطاعت ممکن ہو سکے۔ اس کے برعکس دانشور کا ظہور اٹھارویں صدی میں ہوا اور یہ مذہبی علمیت کے برعکس دوسری علمیت کا علم بردار ہوتا ہے۔ یہ مذہبی علمیت سے علی الرغم ادراکِ حقیقت کا قائل ہوتا ہے۔ یہ انسان کی آزادی اور مساوات کا قائل ہوتا ہے اور ان راہوں کی نشاندہی کرتا ہے جن کے نتیجے میں انسانیت زیادہ سے زیادہ مساوی آزادی حاصل کر کے اپنی خواہشات (نفسانیہ) کو حاصل کر سکتی ہے۔

(۲) کلچرل ہیروز:

اس ریاستی نظام میں چوں کہ تمتع فی الارض اور نفسانی خواہشات کی تکمیل عمل کے قدر کی تعیین کی بنیاد بنتے ہیں لہٰذا ایسے لوگوں کی نشو و نما اور تشہیر کی بہت ضرورت ہوتی ہے جو اس کام میں کامیاب ہو جائیں، عموماً یہ دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔

☆ **اسپورٹس مین:**

لبرل نظام میں کھیلوں (لہو و لعب) کی خاص اہمیت ہے۔ مقامی سطح سے لے کر ملکی اور بین الاقوامی کھیلوں کے مقابلوں کا ایک مستقل سلسلہ لبرل ریاستوں کے تعاون سے جاری رہتا ہے اور مختلف قسم کے کھیل کھیلنے والوں کو ہیروز کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

☆ **سائنسدان:** (سائنسز سے وابستہ افراد میں فزیکل اور سوشل سائنسز سے وابستہ افراد شامل ہیں)

یہ وہ افراد ہیں جنھوں نے کائنات کی طبعی قوتوں پر انسان کا غلبہ اور اختیار بڑھا دیا ہے اور اس اختیار کو بڑھانے کا مقصد تمتع فی الارض ہے۔ ایک زمانے میں یہ فزیکل سائنسدان ہوتے تھے، مگر آج کل میڈیسن اور بائیوٹکنالوجی سے وابستہ افراد کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

ان ہیروز (Heroes) کو یہ مواقع فراہم کیے جاتے ہیں کہ یہ فرد معاشرے کے رول ماڈل بن جائیں۔ لوگ ان کلچرل ہیروز کو بزرگانِ دین کی جگہ رکھنے لگیں۔ علماء اور صوفیاء کو بے وقوف سمجھنے لگیں اور اصلی عوامی لیڈرشپ کا منصب ان تین طرح کے لوگوں کے پاس آ جائے۔ اصلی عوامی لیڈرشپ عموماً سیاسی نہیں ہوتی بلکہ اصلی عوامی لیڈرشپ ان کلچرل ہیروز کے ذریعے پیدا کی جاتی ہے۔ ان کلچرل ہیروز کے ''مداح'' اپنی زندگی میں ان کا طرزِ زندگی اپنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

(۳) ٹیکنوکریٹ اور بیوروکریٹ: ٹیکنوکریسی اور بیوروکریسی بھی سرمایہ دارانہ ریاستوں کے انتظام سے متعلق خاص چیز ہے۔ یہ ایسی اشرافیہ ہوتی ہے جو سرمایہ داری کے مجموعی مفادات کی بنیاد پر انفرادی سرمایہ دارانہ عمل کی تحدید اور ترتیب کرتی ہے۔ اس کا اپنا مفاد اس میں پنہاں ہوتا ہے کہ سرمایہ داری کے مجموعی مفادات کتنے حاصل ہو رہے ہیں؟ ان کو سرمائے کے مجموعی مفادات کے نمائندوں کے طور پر قبول کیا جاتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کا ایک مستقل مسئلہ یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں کوئی عمومی ایجنٹ پیدا نہیں ہوتا۔ مارکیٹ کا جو طریقہ اور نظم قائم ہے اس میں ہر کمپنی اپنے مفادات کی نگرانی اور تحفظ کے لیے سرگرم عمل ہوتی ہے۔ اس کو صرف اس بات سے غرض ہوتی ہے کہ اس کا منافع زیادہ سے زیادہ ہو جائے۔ اس لیے اس نظم میں عمومی سرمائے کے تحفظ کے نمائندے نہیں ہوتے جو اس بات پر نظر رکھ سکیں کہ کوئی مخصوص کمپنی اپنا منافع زیادہ سے زیادہ کرنے کے لیے کوئی ایسا کام تو نہیں کر رہی جس سے مجموعی بڑھوتریٔ سرمایہ کو روکا جا رہا ہے۔ ٹیکنوکریسی اور بیوروکریسی یہ بتاتی ہے کہ تمتع فی الارض کا بہترین طریقہ کیا ہے اور ان سے امید کی جاتی ہے کہ وہ اپنے مفادات سے اوپر اٹھ کر مجموعی سرمایہ کے ایجنٹوں کا رول ادا کریں گے۔ ان کی وفاداریاں اور غیر جانبداریاں (impartiality) سرمایہ دارانہ نظام سے وابستہ ہوتی ہیں۔ اس کے لیے انہیں مخصوص امتحانی نظام سے گزار کر سامنے لایا جاتا ہے اور عمومی نمائندوں کے برعکس ان کی حیثیت ایک مستقل نوعیت کی ہوتی ہے۔ قانون سازی میں بھی یہ اہم رول ادا کرتے ہیں۔ یہ کسی بھی سرمایہ دارانہ نظریئے پر ایمان رکھنے والے ہو سکتے ہیں، چاہے لبرل ہوں یا مسلم قوم پرست یا کمیونسٹ...... سرمایہ دارانہ نظام کا تقاضا ہے کہ ایسا گروہ مستقل تیار ہوتا رہے اور یہ نظریاتی گروہ برسرِ اقتدار بھی ہو اور اس کا اقتدار مقبولِ عام بھی ہو۔

(۴) آرمڈ فورسز (armed forces): اس کی زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں...... یہ سرمایہ داری کو لاحق خطرے کے وقت سامنے آتے ہیں اور سرمایہ داری کا آخری دفاع یہی لوگ کرتے ہیں۔ ہر ملک کی عموماً اپنی آرمی، پولیس اور ریزرو فورسز وغیرہ ہوتی ہیں۔

(۵) استعماری ایجنٹ (Imperial oversight agents): یہ وہ مقامی افراد ہوتے ہیں جن کا فکری تناظر، جن کے مفادات اور وفاداریاں عالمی استعمار کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں۔ چوں کہ سرمایہ دارانہ نظام ایک عالمی نظام ہو گیا ہے اور سرمایہ داری کی جو اصل قوتِ نافذہ ہے، وہ امریکہ ہے۔ اس قوت نافذہ کی ایک ضرورت یہ ہوتی ہے کہ براہِ راست اپنے افراد کے بجائے وہ ایسے مقامی افراد کے ذریعے حکومت کے کاموں میں دخیل ہو جن کی بنیادی وفاداریاں امریکن ایمپائر کے ساتھ ہوں۔ وہ بود و باش تو مقامی لوگوں کا سا رکھیں لیکن تمام تر طرزِ زندگی ایمپائر کی سی ہو، گویا یہ ایمپائر کے غیر مقامی شہری (non national citizens) ہوتے ہیں۔ انگریزوں کی حکومت نے جب محسوس کیا کہ ان کی حکومت کو مقبولیت حاصل نہیں ہے تو انہوں نے مختلف طریقوں خصوصاً تعلیمی نظام کے ذریعے ایسے لوگ تیار کیے اور صرف ہندوستان میں نہیں بلکہ پوری

تیسری دنیا کے اندر ایسے لوگوں کی پوری نسل تیار کی گئی جو فطرتاً ایمپائر ہی کے لوگ ہوں۔ یہ لوگ کلیدی مقامات پر فائز کیے جاتے ہیں۔

حاملین اقتدار ادارے

ہم ان افراد کا تذکرہ کر چکے ہیں جو سرمایہ دارانہ عقلیت کو قبولیتِ عامہ اور غلبہ دلانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اب ان اداروں کا تذکرہ ہے جن کے ذریعے یہ افراد اقتدار کی ترتیب عمل میں لاتے ہیں۔

(ا) کارپوریشن: کارپوریشن کے اندر نظامِ اقتدار سرمایہ داری اپنی کامل ترین شکل میں ہوتا ہے۔ جہاں ایک فرد سرمایہ دارانہ بندھنوں میں ایسے جکڑا ہوتا ہے کہ بڑھوتریٔ سرمایہ کا ایجنٹ بننے کے سوا اور کچھ ممکن نہیں ہوتا۔ کارپوریشن کے اندر جو ترتیبِ نظم ہوتی ہے اس کے نتیجے میں معاش کے پورے عمل پر جس طرح سرمایہ دارانہ عقلیت غالب آتی ہے اور کہیں غالب نہیں آتی۔ سرمایہ دارانہ نظام میں کارپوریشن کے ذریعے ذاتی ملکیت کو ختم کر کے سرمائے کی ملکیت قائم کی جاتی ہے۔ سرمایہ دارانہ تعقل کے لیے انسان کے جاگتے اوقات میں انسان کو خاص قسم کے نظم وضبط میں سمو دیا جاتا ہے اور اس کے ان اوقات میں اسے سرمائے کا خادم بنا دیا جاتا ہے۔ کارپوریشن وہ شخصِ قانونی ہے جس کا اکیلا وظیفہ یہ ہے کہ سرمائے کی بڑھوتری کے پیمانے پر اپنے تمام اعمال کو مرتب کرے۔ کارپوریشن کو چلانے والے منیجر ہوتے ہیں، جو عملاً بڑھوتریٔ سرمایہ کی مشین ہوتے ہیں وہ اپنے ماتحت ملازمین کو بھی اس واحد پیمانے پر پرکھتے ہیں کہ وہ بڑھوتری سرمایہ کا باعث بن رہے ہیں کہ نہیں...... ایک معیشت میں جس قدر کارپوریشن کا عمل دخل بڑھتا ہے اتنی ہی ذاتی ملکیت کم ہو جاتی ہے۔

(ب) بینک اور مالی ادارے: کارپوریشن کے علاوہ دوسرا ذریعہ بینک اور فنانشل ادارے ہیں۔ یہ بھی خالصتاً سرمایہ دارانہ ادارے ہیں۔ ان کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ سرمائے کی بڑھوتری کی بنیاد پر قدر کے تعین کا ایسا نظام نافذ اور قائم کریں کہ زر کی مارکیٹ اور اسٹاک مارکیٹ (capital market) پیداواری عمل کے نظام پر حکم لگانے کی پوزیشن میں آ جائے۔ اس کے لیے بنک یہ فریضہ انجام دیتے ہیں کہ لوگوں کی بچتوں کو اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں تاکہ لوگ اپنے فاضل سرمائے کو خود استعمال نہ کریں بلکہ بینک میں کھاتے کھول لیں اور بینک اس رقم کو سرمایہ کے چکر (circle of capital) میں شامل کر دیں۔ انہی اداروں کے ذریعے سرمایہ داری کو عالمگیر کرنے میں مدد ملتی ہے۔

(ج) فنانشل ریگولیشن (زری تحکیم) سرمایہ دارانہ نظام میں مختلف کمپنیاں اپنے اپنے منافع کو بڑھانے کے لیے مسلسل مسابقت کرتی ہیں۔ اس لیے ایک ریگولیٹری اتھارٹی کی ضرورت ہوتی ہے جو یہ نظر رکھتی ہے کہ اس مسابقت کے نتیجے میں سرمایہ دارانہ نظام بحیثیت مجموعی کسی نظاماتی بحران سے دوچار نہ ہو۔ یہ ریگولیٹری اتھارٹی اس نظاماتی بحران سے بچانے کے لیے پیسہ کی رفتارِ پیداوار میں کمی یا زیادتی کا فیصلہ کرتی ہے۔ بظاہر تو یہ خاص حکومت کا کام لگتا ہے، لیکن اب صرف اسٹیٹ بینک یہ کام نہیں کرتا بلکہ عالمی مالیاتی اور زری ادارے بھی اس میں دخل اندازی کرتے ہیں اور پرائیوٹ سیکٹر میں بھی ایسی ریٹنگ (Rating) ایجنسیاں آ گئی ہیں مثلاً جے پی مورگن وغیرہ جن کا اس سلسلے میں اہم کردار ہوتا ہے۔

(د) لیبر یونینز: کبھی کبھار یہ بھی ہوتا ہے کہ ٹریڈ یونینز بھی سرمایہ دارانہ عقلیت کو غالب کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ انفرادی طور پر تو کارپوریشن کے اندر ہیومن ریسورس مینجمنٹ کے ذریعے یہ کام کیا ہی جا رہا ہے، لیکن اجتماعی طور پر مزدوروں کو سرمایہ دارانہ عقلیت سے بہرہ ور کرنے کا کام مزدور یونینز بھی کرتی ہیں۔ وہ مزدور قوتوں کو اس مقصد کے گرد منظّم کرتی ہیں کہ سرمایہ دارانہ عقلیت کے فروغ کے نتیجے میں جو فوائد حاصل ہو رہے ہیں، ان میں اپنا حصہ طلب کریں اور مزدور بھی اجتماعی طور پر سرمایہ کی بڑھوتری کے عمل کو مہمیز کرنے میں اپنا کردار ادا کریں اور ان کے مفادات بڑھوتریٔ سرمایہ کے اہداف سے زیادہ سے زیادہ ہم آہنگ ہو سکیں۔

(ذ) انتظامیہ (مقامی اور قومی): کسی بھی ملک کے معاملات چلانے کے لیے انہیں مختلف شعبوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے مثلاً داخلہ امور، خارجہ امور، دفاعی امور، تعلیمی امور، معاشی امور...... اور ان سب امور کو چلانے کے لیے ہر ملک میں انتظامیہ کا ادارہ ہوتا ہے، جس کی تنظیم مقامی سے لے کر قومی سطح تک موجود ہوتی ہے۔ انتظامیہ کے ادارے کا کام محض قانون کا نفاذ نہیں ہوتا بلکہ وہ قانون سازی میں بھی نمایاں طور پر حصہ لیتا ہے۔ اکثر قوانین کے مسودے انتظامیہ ہی تیار کرتی ہے۔ عملاً انتظامیہ ہی مقنّنہ کی رہنمائی کرتی ہے اور اس پر حاوی ہوتی ہے اور اس کو سرمایہ دارانہ ڈگر سے نہیں ہٹنے دیتی۔

(ط) میڈیا: جس میں اخبارات ورسائل، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ وغیرہ شامل ہیں۔ سرمایہ دارانہ دائرہ اقتدار کو وسیع کرنے کا اہم ادارہ ہے۔ میڈیا کے سب شعبے یعنی انٹرٹینمنٹ، ایڈورٹائزنگ اور انفارمیشن پہنچانے کا عمل سرمایہ دارانہ نظامِ اقتدار کے استحکام کا باعث بنتے ہیں۔ انٹرٹینمنٹ انڈسٹری سے وابستہ لوگوں کو رول ماڈل اور ہیرو بنایا جاتا ہے۔ ایڈورٹائزنگ کے ذریعے سرمایہ دارانہ کارپوریشن کے مال کی طلب پیدا کر کے اس کی کھپت ممکن بنائی جاتی ہے اور انفارمیشن پہنچانے کے عمل کو بھی مختلف طریقوں (لائسنسنگ پر کنٹرول) کے ذریعے ریگولیٹ کیا جاتا ہے۔ میڈیا کا وسیع نیٹ ورک سرمایہ دارانہ ریاست کے ماتحت ہی ہوتا ہے۔

(ز) عدالتیں: عدلیہ بنیادی طور پر لبرل دستور کی محافظ ہوتی ہے۔ یہ لبرل دستور کی بنیاد پر شہریوں کے دو فریقوں یا سٹیزن اور مملکت اور اس کے مختلف اداروں کے درمیان متنازعہ امور کے فیصلے کرتی ہے۔ ان معنوں میں کورٹس کا بنیادی فریضہ روزمرہ معاملات کی دستور سے ہم آہنگ تشریح وتوضیح کرنا اور مخصوص معاملات پر اس کا اطلاق کرنا ہے۔ دستور جیسا کہ ہم جانتے ہیں' ایسی آزادیوں اور حقوق کے مجموعے کا نام ہے جو فرد کو سرمائے کی بڑھوتری کے فرض کو پورا کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ ان میں سب سے اہم سرمایہ دارانہ ملکیت کا تحفظ اور آزادی کا تحفظ ہے۔

(س) پولیس: پولیس کے محکمہ کا سرمایہ دارانہ اشرافیہ اور عدلیہ سے مخصوص نوعیت کا تعلق ہوتا ہے۔ ریاست میں سرمایہ دارانہ عدل کی بنیاد پر جو فیصلے کیے جاتے ہیں، ان فیصلوں کا نفاذ پولیس کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ سرمایہ دارانہ معاشرہ اور ریاست جس مخصوص نہج پر استوار ہوتے ہیں اس مخصوص نہج سے انحراف کرنے والوں پر پولیس نظر رکھتی ہے۔ بعض اوقات سرمایہ دارانہ اشرافیہ اپنے مخالفین کو کچلنے کا کام بھی پولیس سے لیتے ہیں۔

(ش) آرمڈ فورسز: سرمایہ دارانہ ریاستیں اصولاً قومی ریاستیں ہوتی ہیں اور اصولاً اس قومی ریاست کو اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہوتا ہے، یعنی نہ تو اندرونِ ملک کوئی فرد یا گروہ ریاست کے دائرہ اختیار سے باہر ہو سکتا ہے اور نہ کوئی بیرونی طاقت یا گروہ اس نیشن اسٹیٹ کی مرضی کے بغیر اس کے حاصل کردہ اختیار کو چیلنج کر سکتی ہے۔ اقتدارِ اعلیٰ کے اس تحفظ کے لیے بنیادی طور پر فوج کا ادارہ ہوتا ہے۔ سرمایہ دارانہ لبرل ریاست کا آخری دفاع آرمڈ فورسز ہی کرتی ہیں۔

(ص) مقنّنہ (legislature)

مقنّنہ عموماً دو ایوانوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ ایوانِ زیریں عوام کی نمائندہ سمجھی جاتی ہے اور ایوانِ بالا میں مخصوص طبقوں یا علاقوں کو نمائندگی دی

جاتی ہے۔ انتخاب کی غرض سے تمام ملک کو مختلف حلقوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے اور ہر حلقے سے اراکین کی مقررہ تعداد ایک متعینہ مدت کے لیے ایوانِ زیریں میں نمائندگی حاصل کرتی ہے۔ اصولی طور پر مقنّنہ کا اولین فرض قانون سازی ہوتا ہے اور عوام کے نمائندے معاشرہ کے بدلتے ہوئے حالات اور وقت کے تقاضوں کے مطابق قانون بناتے ہیں۔ قوانین میں ردوبدل کرنا یا ان کی تنسیخ کرنا بھی مقنّنہ کا کام ہوتا ہے اور تمام ارکان کے بحث ومباحثہ اور اظہارِ خیال کے بعد مقنّنہ کو اختیار ہوتا ہے کہ کثرتِ رائے سے پیش کیے جانے والے بل کو منظور کر دے، لیکن فی الواقع جدید دور میں یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ مقنّنہ کا کردار مسلسل کم ہورہا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ تو وہی ہے کہ سرمایہ دارانہ لبرل ریاستوں کو عالمی سرمایہ دارانہ استعماری ریاست اپنی مرضی کے قوانین بنانے پر مجبور کرتی ہے اور عموماً یہ کام ٹیکنوکریسی کرتی ہے۔ مقامی ٹیکنوکریسی بھی صرف وہ اقدامات بروئے کار لاتی ہے جو عالمی سرمایہ دارانہ قوانین سے ہم آہنگ ہوں۔ جب مقنّنہ کا بنیادی فریضہ ہی ادا نہ ہو تو گویا یہ کمزورترین ادارہ بن کر رہ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی چند جزوی وجوہات ایسی ہیں کہ مقنّنہ کا کردار کم سے کم ہوتا جارہا ہے، مثلاً ہر انفرادی ممبر اپنی جماعت کی طرف سے پیش کیے گئے بل پر عموماً توثیق ہی کرتا ہے، چناں چہ اس عمل سے اس کی عدم دلچسپی بڑھتی جاتی ہے۔ مقنّنہ کے اندر متعلقہ شعبے کے ماہرین مثلاً دفاعی، معاشی، تعلیمی، معاشرتی ماہرین کم ہوتے ہیں، اس لیے وہ اس

شعبہ سے متعلق قانون سازی کی سکت ہی اپنے اندر نہیں پاتے۔ لہٰذا صرف پاکستان کی مثال ہی نہیں بلکہ یورپ اور امریکہ ہر جگہ اب پارلیمنٹ یا مقنّنہ کا کوئی کردار نہیں رہ گیا۔ پارلیمنٹ تو محض کھیل تماشہ ہے کیوں کہ حکومتوں میں تبدیلیوں کے نتیجے میں پالیسیوں کے اندر کسی قسم کی تبدیلی نہیں آتی۔

(ض) عالمی ریٹنگ ایجنسیاں اور نگراں ایجنسیاں: اب بین الاقوامی سطح پر ایسے ادارے وجود میں آچکے ہیں جو ملکی سطح پر اہم ترین امور پر مکمل دخیل ہو چکے ہیں، مثلاً آئی ایم ایف، ورلڈ بینک، یونائیٹڈ نیشن کے مختلف ادارے۔ انہوں نے قومی اداروں سے مخصوص نوعیت کا تعلق استوار کرلیا ہے۔ آئی ایم ایف کے پاس صرف یہ سکت نہیں ہے کہ وہ ہماری معاشی پالیسی کے بارے میں فیصلہ کرے بلکہ وہ اپنے فیصلے کے نفاذ کا ایک خاص میکنزم بھی رکھتا ہے۔ اسی طرح اب پرائیوٹ سیکٹر کی ریٹنگ ایجنسیوں کا ظہور بھی ہورہا ہے۔ یہ ایجنسیاں سرمایہ دارانہ اصولوں کی بنیاد پر ملکوں کی کارکردگی کو مسلسل جانچتی رہتی ہیں اور ان کی جانچ کا اثر کسی ملک میں ہونے والی بیرونی اور اندرونی سرمایہ کاری پر پڑتا ہے۔

(ط) تعلیمی نظام: سرمایہ دارانہ علمیت اس وقت غالب آتی ہے جب مذہبی علمیت پر سے لوگوں پر اعتبار اٹھ جاتا ہے۔ یہ عمل مغرب کے اندر اٹھارویں صدی میں پروان چڑھا۔ کلیسا جو کہ قدیم مذہبی علمیت کا علمبردار تھا' اس کو دورِتنویر کے مفکرین نے شکست دے دی۔ تنویری فکر کی بنیاد پر جن علوم کا ظہور ہوا اسے فزیکل سائنس اور سوشل سائنسز کہا جاتا ہے۔ یہ سرمایہ دارانہ نظامِ کی ٹیکنالوجی اور سرمایہ دارانہ عقلیت کو جواز فراہم کرنے والے علوم ہیں۔ ان کی بنیاد پر مغرب کا پورا نظام تعلیم تشکیل پایا۔ تیسری دنیا پر استعماری طاقتوں کے غلبے کے بعد وہاں بھی یہی تعلیمی نظام مستحکم ہوا۔ اب یہی اسکول کی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم کا مکمل نظام ہے جسے لوگوں نے برضا ورغبت قبول کرلیا ہے اور مذہبی علوم کے بجائے اس تعلیمی نظام میں پڑھائے جانے والے علوم کو فوقیت اور ترجیح دی جاتی ہے۔ تعلیمی نظام کے ان اداروں کے ذریعے سرمایہ دارانہ عقلیت کو جوازِ عمومی اور قبولیتِ عامہ فراہم کی جارہی ہے۔

اب تک جن حاملینِ اقتدار اداروں یا processes کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں اہمیت کے لحاظ سے کوئی ترتیب قائم نہیں کی گئی بلکہ ان کا محض تعارف اور خاکہ پیش کر دیا گیا۔ دراصل لبرل ریاست دو مختلف دائرہ ہائے کار میں تقسیم ہو جاتی ہے، یعنی جمہوری طرزِ حکومت اور آمرانہ (Authoritarian) طرزِ حکومت...... جمہوری طرزِ حکومت میں ان اداروں کی تقدیم اور ترتیب اس سے مختلف ہوتی ہے جو آمریت میں ہوتی ہے۔ ذیل میں جمہوری طرزِ حکومت کی ممکنہ ترجیحی ترتیب کی فہرست دی جاتی ہے۔

۱۔ بینک اور فنانشل ادارے

۲۔ فنانشل ریگولیشن کے ادارے

۳۔ انٹلیکچوئل

۴۔ استعماری ایجنٹ

۵۔ میڈیا

۶۔ عدالتیں

۷۔ بین الاقوامی نگراں ایجنسیاں اور عالمی ریٹنگ ایجنسیاں

۸۔ مقنّنہ

۹۔ پولیس

۱۰۔ آرمڈ فورسز

۱۱۔ ٹریڈ یونین

جب کہ آمریت یا Authoritarian ریاست میں ممکنہ ترجیحی ترتیب ذیل کے مطابق ہوسکتی ہے۔

(۱) پولیس

(۲) آرمڈ فورسز

(۳) استعماری ایجنٹ

(۴) عدالتیں

(۵) میڈیا

(۶) انٹلیکچوئل

(۷)بینک اور فنانشل ادارے

(۸)فنانشل ریگولیشن کے ادارے

(۹)بین الاقوامی نگراں ایجنسیاں

(۱۰)مقنّنہ

اب تک جن Personnel اور اداروں کا تذکرہ کیا گیا ہے، ان کے بارے میں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ یہ پرسنل اور ادارے حکومت نہیں کر رہے بلکہ ان کے ذریعے حکومت کی جا رہی ہے۔ حکومت اور اقتدار اس چھوٹے سے گروپ کا ہے جو سرمایہ دارانہ عقلیت کو پورے طور پر قبول کیے ہوئے ہے اور اس عقلیت کی عالمگیریت کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھتا ہے۔ ایسے لوگ وہ تمام پرسنل اور ادارے جن کا تذکرہ کیا گیا ہے ان کے اندر بھی پائے جاتے ہیں اور باہر بھی......اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ چھوٹا سا گروپ اپنی حکومت کیسے کرتا ہے؟

یہ اپنی حکومت دو طریقوں سے کرتا ہے:

ا۔نمائندگی(Representation)

۲۔نفاذِ احکام بذریعہ طاقت(Mediation)

1۔ پہلے طریقے میں یہ باور کرانے کی کوشش کرائی جاتی ہے کہ اس پر کوئی نزاع موجود نہیں ہے کہ سرمائے کی بڑھوتری ہی قدر کے تعین کا واحد پیمانہ ہے۔ سب لوگ اس کے قائل ہیں اور یہی اصول ہم کو نمائندگی کا جواز فراہم کرتا ہے، کیوں کہ ہم ہی اس مفادِ عامہ کو فروغ دینے والی قوت ہیں اور ہم ان تمام پرسنل اور اداروں کے ذریعہ وہی کر رہے ہیں جس کو مقبولیتِ عامہ حاصل ہے۔ تینوں طرح کی سرمایہ دارانہ ریاستیں چاہے وہ (۱) لبرل ہوں (۲) اشتراکی ہوں (۳) قوم پرست ہوں، اس جائز نمائندگی کا دعویٰ کرتی ہیں۔

2۔mediation کے طریقے میں سرمائے کے عمومی مفاد کی ایک خاص تعبیر غالب اشرافیہ بزورِ قوت نافذ کرتی ہے۔ چوں کہ سرمایہ داری ایک جاہلیت ہے اور اس جاہلیت سے کسی قدر بھی خیر کا تصور نہیں کیا جا سکتا اس لیے لامحالہ بیک وقت سرمائے کے مفادِ عمومی کی مختلف جہتوں سے مختلف تعبیریں کی جاتی ہیں۔ لیکن وہ چھوٹا سا گروپ جو کہ حکومت کر رہا ہے، وہ mediation کے ذریعہ یہ باور کراتا ہے کہ سرمایہ دارانہ مفادات کا جو تصور وہ رکھتا ہے، وہی درست ہے اور اس کے عمومی مفاد کی تعبیر کے تحت مختلف انفرادی سرمایہ دارانہ مفادات کی تعبیروں کی تحدید کی جائے اور سرمائے کے عمومی مفاد کے تحفظ کے لیے اس کے تصور کے مطابق معاشرے اور ریاست کی صورت گری کی جائے۔

یہ دونوں کام بیک وقت بھی کیے جا رہے ہوتے ہیں یعنی غالب اشرافیہ کی تعبیرِ مفادِ عمومی کو مسلط بھی کیا جا رہا ہوتا ہے اور نمائندگی کے اداروں کے ذریعہ اس مخصوص تعبیر کے حق میں رائے بھی بنائی جا رہی ہوتی ہے۔ نمائندگی جن اداروں (proceses) کے ذریعہ حاصل کی جاتی ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

ا۔انٹرسٹ گروپس..................Interest Groups

۲۔ہیروز کی پرستش..................Heroes

۳۔سیاسی پارٹیاں............Political Parties

۴۔ایڈمنسٹریشن اینڈ کورٹس......Administration and courts

(1)انٹرسٹ گروپس:

انٹرسٹ گروپس وہ ہوتے ہیں جو کسی سرمایہ دارانہ حق کی طلب کی بنیاد پر لوگوں کو جمع کرتے ہیں۔ مثلاً پانی، صفائی وسیوریج کے مسائل، تعلیم، عورتوں پر ظلم وغیرہ وغیرہ......ظاہر ہے کہ جب اس قسم کے سرمایہ دارانہ حقوق کی بنیاد پر لوگوں کو مجتمع کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو اس میں جمع ہونے والوں کی اخلاقی اور مذہبی حالت کی بنیاد پر کوئی تخصیص روا نہیں رکھی جاتی، مثلاً وہ مسلمان ہے یا قادیانی یا کوئی اور، اسی طرح نمازی و پرہیزگار ہے یا زانی، شرابی اور بے نمازی......بس ان کا مخصوص سرمایہ دارانہ حق کی طلب پر متفق ہونا ضروری ہوتا ہے۔ گویا ان انٹرسٹ گروپس کے ذریعہ وہ سرمایہ دارانہ اشرافیہ جو حرص وحسد کو عالمگیر کرنا چاہتی ہے، وہ نفوذ کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ سرمایہ دارانہ حقوق کو طلب کر کے سرمایہ دارانہ نظام کو ہی مستحکم کیا جاتا ہے۔ ان کے نتیجے میں غیر سرمایہ دارانہ نظام نہیں برپا کیا جا سکتا۔

(2) ہیروز:

سائنٹیفک ہیروز ہوں یا میڈیا کے ہیروز، ان کی امیج بلڈنگ کر کے بھی معاشرہ میں نفوذ کیا جاتا ہے، کیوں کہ اگر یہ لوگ مقبولِ عام ہوتے ہیں تو سرمایہ دارانہ عقلیت بھی مقبولِ عام ہوتی ہے۔

(3)سیاسی پارٹیاں:

بنیادی طور پر سیاسی پارٹیاں بھی سرمایہ داری سے مختص ہیں۔ سرمایہ داری سے پہلے جو مختلف گروہ اور طبقات سیاسی عمل میں شامل ہوتے تھے ان میں سیاسی پارٹیوں کی similarities تو تلاش کی جا سکتی ہیں، لیکن جن معنوں میں اب سیاسی پارٹیاں خصوصاً اپوزیشن پارٹیاں وجود رکھتی ہیں، وہ سرمایہ دارانہ نظام سے پہلے نہیں تھیں۔ مختلف پارٹیاں ایک ہی سیاسی نظام پر بنیادی طور پر متفق ہوتی ہیں۔ اس نظام پر اصولی اتفاق کے بعد ان کے اختلافات جزوی اور فروعی ہوتے ہیں۔ یہ پارٹیاں لوگوں کو ایک اجتماعیت فراہم کرتی ہیں۔ لوگ ان کی لیڈرشپ کو اپناتے ہیں اور اپنا ایک خاص تشخص اور اپنی ایک خاص شناخت ان کے ذریعہ قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس خاص تشخص اور شناخت کے لیے اپنی توانائیاں اور صلاحیتیں صرف کرتے ہیں۔ یہ پارٹیاں سرمایہ دارانہ اشرافیہ کے نفوذ کا اس لیے اہم ذریعہ ہیں کہ ان کی بنیادیں، شناخت اور تشخص اصولی طور پر سرمایہ دارانہ نظام کے استحکام ہی سے وابستہ ہوتی ہیں۔

(4) ایڈمنسٹریشن اور کورٹس:

قانون کا نفاذ اس طریقے سے کیا جاتا ہے کہ وہ قانون غیر جانبدار نظر آئے۔ فیصلے ایسے ہوں کہ وہ مفادِ عامہ کو مدِنظر رکھتے ہوئے غیر جانبدارانہ طور پر کیے جائیں تاکہ سرمایہ دارانہ نظام پر ایمان متزلزل نہ ہو اور کسی غیر سرمایہ دارانہ نظام کی جانب جھکاؤ نہ ہو۔

(5)سرمایہ دارانہ تحریکیں:

سرمایہ دارانہ تحریکیں مثلاً قوم پرست، اشتراکی یا انارکسٹ تحریکیں سرمایہ دارانہ اشرافیہ کے نفوذ کا اہم ذریعہ ثابت ہوئی ہیں، کیوں کہ ان میں

بھی غیر سرکاری تنظیموں (NGOs) اور پروفیشنلز ایسوسی ایشنز اور انٹرسٹ گروپس کی طرح سرمایہ دارانہ حقوق کو ہی طلب کیا جاتا ہے۔ ان تحریکوں کے نتیجے میں سرمایہ دارانہ اشرافیہ ہی کی سبقت قائم کی جاتی ہے اور سرمایہ دارانہ عقلیت ہی عمومیت اختیار کرتی ہے۔

قوم پرست اور اشتراکی تحریکیں لبرل سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف بڑی کامیاب تحریکیں رہی ہیں، لیکن انہوں نے بھی لبرل سرمایہ داروں کی جگہ قوم پرست اور اشتراکی سرمایہ داروں کی حاکمیت قائم کی ہے، کوئی غیر سرمایہ دارانہ نظام نہیں قائم کیا۔

۲۔ Mediation:۔

جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے Mediation کے ذریعہ سرمایہ کے عمومی مفاد کی ایک خاص تعبیر کو نافذ کیا جاتا ہے۔ Mediation مندرجہ ذیل اداروں اور طریقوں کے ذریعے کی جاتی ہے۔

(۱) فوج و پولیس۔

(۲) کورٹس اور عدلیہ کا نظام۔

(۳) شمولیت (سیاسی مخالفین کو ساتھ ملانا)۔

(۴) اخراج کردینا (مخالفین کو بے دست وپا کردینا)۔

(۵) سوشل ویلفیئر۔

(۶) صنعتی تعلقات۔

ایک خاص قسم کے ڈسپلن کو نافذ کرنے کے لیے سب سے اہم ادارے تو پولیس اور فوج ہیں۔ اس کے علاوہ کورٹس اور عدلیہ کا نظام ہے۔ یہ اس لیے اہم ہیں کہ سرمایہ دارانہ عقلیت میں راسخ العقیدہ لوگ جو فیصلے کرتے ہیں اس میں یہ کوشش کی جاتی ہے کہ وہ فیصلے مقبولِ عام بھی ہوں۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی بہت اہم ہے اور اس بات کو بھی ممکن بنایا جاتا ہے کہ اگر ان کے خلاف کوئی عمل ہو تو ان کو سزا بھی دی جا سکے۔ اس کے لیے مذکورہ ادارے بہت اہمیت کے حامل ہیں۔

شمولیت (Co-option):

اس سے مراد یہ ہے کہ ایسے گروہوں کو ساتھ ملا لیا جائے جو کسی طرح راہ میں رکاوٹ بن سکتے ہوں اور جو سرمایہ دارانہ نظام کے اپوزیشنل گروپ نظر آتے ہوں۔ سرمایہ دارانہ نظام میں ''شمولیت'' کی ایک بہترین مثال سوشل ڈیموکریسی کی ہے۔ سوشل ڈیموکریسی کے ذریعہ سوشلسٹ طرزِ فکر کے حاملین کو اس کا قائل کرلیا جاتا ہے کہ وہ سرمایہ دارانہ نظام میں محدود حقوق کی طلب پر اکتفا کرلیں۔ اس میں مزدوروں نے اپنی جدوجہد اس پر مرکوز کردی کہ اس نظام یعنی سرمایہ دارانہ نظام میں میرا وہ حصہ مجھے نہیں دیا جارہا جس کا میں حق دار ہوں، لہٰذا مزدوروں کی جماعت کو حکومت میں شامل کرلیا جائے۔ اس طرح محدود حقوق فراہم کرکے اور مراعات فراہم کرکے بڑی جدوجہد سے ان کو دست کش کرالیا جاتا ہے۔ co.option کی اور بھی مثالیں ہوسکتی ہیں مثلاً اسلامی جماعتوں کو بھی اگر سرمایہ دارانہ حکومت میں شامل کرلیا جائے تو وہ سرمایہ دارانہ نظامِ ریاست کا ایک جواز فراہم کرسکتی ہیں اور اسلامی امارت وخلافت کی جدوجہد سے دست کش ہوسکتی ہیں اور اس بات پر راضی ہوسکتی ہیں کہ محدود مراعات حاصل کرلیں اور معمولی اور بے ضرر قسم کے علاماتی اسلامی اقدامات پر مطمئن ہوجائیں۔ اس co.option سے co.opt ہونے والا گروہ اپنی فطری Constituency سے دور ہوتا چلا جاتا ہے اور اس Constituency میں اپنی legitimacy کھو دیتا ہے۔

اخراج (Exclusion):

سرمایہ دارانہ نظام میں معاشی عمل اور سیاسی عمل اس طرح ترتیب دیا جاتا ہے کہ قوت ان ہاتھوں میں مرتکز ہوتی چلی جاتی ہے جو سرمایہ کی بڑھوتری کے اصول کو بنیادی عقیدہ بنالیتے ہیں اور جو یہ عقیدہ نہیں رکھتے انہیں اس قابل نہیں رہنے دیا جاتا کہ وہ مجموعی سیاسی یا معاشی عمل میں کوئی فیصل کردار ادا کرسکیں۔ صوفیاء کرام کی معاشرتی اور ریاستی حیثیت کو اس نہج پر پہنچا دیا گیا ہے کہ وہ فیصل کردار ادا نہ کرسکیں۔

سوشل ویلفیئر:

آخری چیز سوشل ویلفیئر ہے۔ یعنی رفاہِ عامہ کے کاموں پر ہی ساری جدوجہد کو مرکوز کردیا جائے اور عوام کو سیاست علیا کے معاملات سے ہٹا کر مرکزی معاملہ یہی رہ جائے کہ رفاہِ عامہ کے کتنے کام ہو رہے ہیں؟ اسی طرح سوشل ویلفیئر سسٹم اور نیشنل انشورنس کا پورا نظام ہے جس کے ذریعہ سرمائے کے مفادِ عمومی کی ایک خاص تعبیر کے نفاذ کو ممکن بنایا جاتا ہے اور یہ طریقے ہیں جن سے سرمایہ دارانہ ڈسپلن قائم ہوتا ہے۔

بطورِ نمائندگی جن اداروں اور طریقہ کار کا تذکرہ ہوا اور بطورِ Mediation جن اداروں اور طریقہ کار کا تذکرہ ہوا ان کو جمہوری حکومتوں میں بھی بروئے کار لایا جاسکتا ہے اور استبدادی (ڈکٹیٹرشپ) حکومتوں میں بھی بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔ ذیل میں وہ مختلف ترتیب بیان کی جاتی ہے جو میرے خیال میں مختلف طرز کی حکومتوں میں ممکن ہے۔ نمائندگی کے ادارے اگر جمہوری حکومت میں ہوں تو ان کی مندرجہ ذیل ترتیب ہوسکتی ہے:

(۱) انٹرسٹ گروپس (۲) سیاسی جماعتیں (۳) بیروز (۴) انتظامیہ اور کورٹس

نمائندگی کے اداروں کی ترتیب استبدادی حکومت میں مندرجہ ذیل طریقے سے ممکن ہے:

(۱) عوامی تحریکیں (۲) بیروز (۳) انتظامیہ اور کورٹس (۴) انٹرسٹ گروپس

اسی طرح Mediation کے اداروں کی ترتیب جمہوری حکومت میں مندرجہ ذیل ہوسکتی ہے:

(۱) کورٹس اور عدلیہ کا نظام (۲) شمولیت (Mediation) (۳) سوشل ویلفیئر (۴) اخراج (۵) پولیس اور فوج

اس کے علاوہ Mediation کے اداروں کی ترتیب استبدادی حکومتوں میں یوں ممکن ہے:

(۱) کورٹس اور عدلیہ کا نظام (۲) پولیس اور فوج (۳) اخراج (۴) شمولیت (۵) سوشل ویلفیئر

اب تک سرمایہ دارانہ ریاست کا ایک عمومی خاکہ مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگر ہم کسی جگہ اسلامی نظام کو غالب کرنا چاہتے ہیں تو وہاں سے سرمایہ دارانہ نظام کا کلیتاً انہدام ضروری ہے، کیوں کہ اسلامی نظام اور سرمایہ دارانہ نظام میں اختلاف جزوی نہیں بلکہ اصولی اور بنیادی ہے۔ اب یہ اسلامی نظام کی پیش قدمی اور سرمایہ دارانہ نظام کا کسی مخصوص ملک سے اخراج کس طرح ممکن ہوگا اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے مخصوص ملک سرمایہ داری اور اس کی مخصوص نوعیت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اگر ہم پاکستان میں ایسی اقدامی حکمتِ عملی ترتیب دیں اور پیش قدمی کرنا چاہیں تو دینی تحریکوں کو مندرجہ ذیل سوالوں کے جوابات حاصل کرنا ضروری ہے:

(۱) پاکستانی ریاست کی نوعیت کیا ہے؟

(۲) کیا پاکستان ایک قومی لبرل ریاست ہے یا استعماری باجگزار ریاست؟ یا دونوں کا مجموعہ ہے؟

(۳) پاکستان میں سرمایہ دارانہ عقلیت غالب کرنے کے لیے کون سے ادارے کلیدی اور کون سے معاونین کی حیثیت رکھتے ہیں؟

(۴) کیا ان کلیدی اور معاونین گروپس میں تعلق مفاہمت کا ہے یا مخاصمت کا؟ اور مخاصمت کی صورت میں اس کی نوعیت کیا ہے؟

(۵) طرزِ حکومت کی ترجیحات اور قوتِ نافذہ کے استعمال کے تناظر میں کیا پاکستان ایک لبرل جمہوری ریاست ہے یا آمرانہ؟

(۶) سرمایہ داری کے استحکام اور فروغ کے لیے پاکستان میں بحیثیت قومی لبرل ریاست یا باجگزار ریاست کیا بنیادی فیصلے ہو رہے ہیں؟

(۷) ان فیصلوں کے صدور اور نفاذ کے لیے کون سے ادارے، پروسیس (processes) اور افراد اہمیت کے حامل ہیں؟

(۸) کون سے افراد یا کون سے عہدے کی سطح پر کلیدی فیصلے کیے جاتے ہیں اور وہ کیا اسٹرکچرز ہیں جن سے ان کی تنفیذ کو ممکن بنایا جاتا ہے؟

(۹) بیوروکریسی میں فیصلہ کرنے کی اہم ترین سطح کیا ہے اور ان فیصلوں کی تنفیذ کی اہم ترین سطح کیا ہے؟

(۱۰) کون سے ادارے اور کون سے عوامل ہیں جن کو کمزور کر کے سرمایہ دارانہ تعقل کو غیر معقول کیا جا سکتا ہے؟

سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کے انہدام کی حکمتِ عملی

اور جماعت اسلامی کی ذمہ داریاں

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ سرمایہ داری رائج الوقت عالمگیر نظامِ زندگی ہے اور قوم پرستی، سیکولرازم، سوشلزم، لبرل ازم، انارکزم اور سوشل ڈیموکریسی اس نظامِ زندگی کے نظریات ہیں۔

ہم سرمایہ داری کو ایک نظامِ زندگی اس لیے کہتے ہیں کہ اس کے مخصوص عقائد ہیں۔ ان عقائد کی بنیاد پر وہ مختلف النوع انفرادیتیں، معاشرتیں اور ریاستیں تعمیر کرتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظریات......قوم پرستی، سیکولرازم سوشلزم، لبرل ازم، انارکزم اور سوشل ڈیموکریسی، سب سرمایہ دارانہ عقائد کو قبول کرتی ہیں لیکن ان عقائد کو بروئے کار لانے کے لیے جس قسم کی انفرادیت، معاشرت اور ریاست کے قیام اور استحکام کی ضرورت ہے، اس کی تفصیل بیان کرنے میں ان نظریات میں اختلاف ہے۔

ہر راسخ العقیدہ قوم پرست، سیکولرسٹ، سوشلسٹ، لبرل، انارکسٹ اور سوشل ڈیموکریٹ سرمایہ داری کے کلمۂ خبیثہ ''لا الہ الا الانسان'' پر ایمان لاتا ہے۔ ہر قوم پرست، سیکولرسٹ، سوشلسٹ، لبرل، انارکسٹ اور سوشل ڈیموکریٹ کافر ہے اور قوم پرستی، سیکولرازم، سوشلزم، لبرل ازم، انارکزم اور سوشل ڈیموکریسی کفر ہیں کیونکہ ان نظریات کو قبول کرنے والوں کا عقیدہ ہے: کہ

''انسان فطرتاً قائمِ بالذات اور خالقِ ذات و کائنات (Self Detemined and Autonomous) ہے۔ وہ اپنی خواہش اور خرد کے مطابق حقیقت کو معنی دینے کا مکلّف ہے۔ حصولِ آزادی (Freedom)، مساوات (Equality) اور ترقی (Progress) کی جدوجہد کے ذریعے انسان کی فطری الوہیت آشکار ہوتی ہے اور وہ تسخیرِ کائنات کے ذریعے اپنے رب العالی اور قادرِ مطلق ہونے کی تصدیق کرتا ہے''

یہ قوم پرستی، سیکولرازم، سوشل ازم، لبرل ازم، انارکزم اور سوشل ڈیموکریسی کے متفق علیہ عقائد ہیں لیکن بہت سے مسلمان شعوری طور پر

ان عقائد کی نوعیت اور ماہیت اور ان کے تاریخی تناظر سے واقف نہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظریات کی عملی جہتوں کو ان کے عقائد کی بنیادوں سے جدا کیا جاسکتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اسلامی عقائد اور سرمایہ دارانہ نظریات کا مرکب تیار کیا جاسکتا ہے اور اس ملغوبہ سے مسلم قومیت، اسلامی سوشلزم، اسلامی جمہوریت وغیرہ تعمیر کی جاسکتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ناممکن ہے کیوں کہ سرمایہ دارانہ نظریات کا مقصدِ وجود ہی سرمایہ دارانہ عقائد کی توجیہہ اور توضیح ہے۔ لبرل ریاست اور سوشلسٹ معاشرت میں اسلامی انفرادیت فروغ نہیں پاسکتی۔

مولانا حسرت موہانی رحمہ اللہ، مولانا عبید اللہ سندھی رحمہ اللہ، مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ، علامہ اقبال اور علامہ علی شریعتی یہ سب راسخ العقیدہ مسلمان اور بڑے پائے کے عشاقِ رسول ﷺ تھے لیکن ان سب نے قوم پرستی، لبرل ازم اور سوشل ازم کی اسلام کاری کی سعی کی اور سرمایہ دارانہ معاشرتی اور ریاستی صف بندی کو غلبہ اور تحفظِ دین کا ذریعہ گردانا (علمائے دیوبند بریلی اور جعفریہ کی پیہم تنبیہات کے باوجود) یہ کیسے ممکن ہوا؟ میری رائے میں اس کی ایک بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم نے شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے وضع کردہ تصورِ نظام کی تشریح اس کے وضع ہونے کے تقریباً دو صدیوں کے بعد کی، اور مولانا مودودی وہ نابغۂ روزگار عالمِ دین اور متکلمِ اسلام ہیں، جنہوں نے اس کلیدی نظریاتی تصور کے احیاء کا حق ادا کر دیا۔

تاریخِ اسلام میں پہلی مرتبہ آپ نے مغرب کو جاہلیتِ خالصہ کے طور پر پیش کیا اور اسلام کو مغرب کے مقابل ایک مکمل نظامِ حیات گردانا اور اسلامی نظامِ زندگی کی انفرادیت، معاشرت اور سیاست کو تفصیلاً اُجاگر کیا۔ آپ نے تحفظِ دین اور غلبۂ دین کے عمل کے ارتباط کو واضح کیا اور انقلابِ اسلامی کا نظریاتی تصور پیش کیا۔

انقلاب ایک عمل ہے واقعہ نہیں ہے۔ اسلامی انقلابی جماعت مکمل نظاماتی تغیر کے لیے جدوجہد کرتی ہے۔ ہر نظامِ زندگی کی تین جہتیں ہوتی ہیں:......انفرادیت، معاشرت اور ریاست۔

جب ہم سرمایہ داری کو ایک نظامِ زندگی کہتے ہیں تو ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ سرمایہ داری ایک مخصوص شخصیت، معاشرت اور ریاست کو قائم کرتی اور فروغ دیتی ہے۔ اسلامی انقلابی جماعت سرمایہ دارانہ شخصیت، سرمایہ دارانہ معاشرت اور سرمایہ دارانہ ریاست کی مکمل تحلیل اور تسخیر کے لئے جدوجہد کرتی ہے۔ کوئی بھی سرمایہ دارانہ نظریاتی جماعت، قوم پرست، لبرل، سوشلسٹ، انارکسٹ، سوشل ڈیموکریٹ، سرمایہ دارانہ شخصیت، معاشرت اور ریاست کی مکمل تسخیر کے لیے جدوجہد نہیں کرتی، کیوں کہ یہ تمام جماعتیں سرمایہ داری کے بنیادی عقائد، یعنی آزادی، مساوات اور ترقی پر ایمان رکھتی ہیں۔ ان سب کا کلمہ ''لاالٰہ الاالانسان'' ہے۔ لہٰذا یہ تمام جماعتیں سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی میں جزوی اصلاح کی قائل ہیں اور سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کی تسخیر کی جستجو نہیں کرتیں۔ یہ جماعتیں ایک غیر سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی (مثلاً عیسائیت) کو مسخر کر کے سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی قائم کرسکتی ہیں اور سرمایہ دارانہ نظام کے اندر انقلابی تبدیلیاں لاکر اس کی اداراتی ساخت تبدیل کرسکتی ہیں (مثلاً اشتراکی انقلاب کے ذریعے سرمایہ دارانہ ریاست کی حیثیت یکسر تبدیل ہوجاتی ہے اور معاشرے پر مارکیٹ کی گرفت معدوم ہوجاتی ہے،) اس لیے ہم سوشلسٹ انقلاب کو ایک سرمایہ دارانہ انقلاب کہہ سکتے ہیں، لیکن یہ انقلاب سرمایہ داری کی تسخیر کا انقلاب نہیں کیوں کہ یہ سرمایہ دارانہ اہداف اور عقائد، آزادی، مساوات اور ترقی کے فروغ اور استحکام کے لیے ایک نئی سرمایہ دارانہ اداراتی صف بندی قائم کرتا ہے۔ سوشلزم ایک سرمایہ دارانہ نظریہ ان معنوں میں ہے کہ وہ سرمایہ دارانہ عقائد آزادی، مساوات اور ترقی پر ایمان رکھتا ہے اور سرمایہ دارانہ علمیت، یعنی سائنس (Science) اور سوشل سائنسز (Social Science) کو معقول گردانتا ہے۔ (یہی باتیں قوم پرستی، انارکزم وغیرہ کے بارے میں کہی جاسکتی ہیں) لیکن کوئی سرمایہ دارانہ نظریاتی جماعت سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کو مسخر نہیں کرسکتی، نہ کوئی ایسی غیر سرمایہ دارانہ جماعت یہ کام کرسکتی ہے جو سرمایہ داری کو بحیثیت ایک نظامِ زندگی کے نہیں پہچانتی۔ یہ کام صرف وہ جماعت کرسکتی ہے جو

☆ آزادی، مساوات اور ترقی کو بحیثیت اہداف اور عقائد کے رد کرے۔

☆ ان اہداف کے لیے جو شخصیتی، معاشرتی اور ریاستی صف بندی کی گئی ہے اس کے باہمی ارتباط کو پہچانے اور ارتباط کے اس جہت کو ایک مکمل نظامِ زندگی کے طور پر سمجھے۔

☆ اس نظامِ زندگی کی مکمل تسخیر اور تحلیل کے لیے ایک جامع منصوبہ ترتیب دینے اور تنفیذ کرنے کی اہلیت بتدریج مجتمع کرنے کی اہلیت رکھتی ہو۔

سرمایہ داری کے انہدام کی حکمتِ عملی:

سرمایہ داری کے انہدام کی ذمہ داری جماعتِ اسلامی پر عائد ہوتی ہے کیوں کہ یہی وہ راسخ العقیدہ اسلامی جماعت ہے جس نے سرمایہ داری کو بحیثیت ایک مکمل نظامِ زندگی کے پہچانا ہے لیکن یہ کام جماعتِ اسلامی تنہا انجام نہیں دے سکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کے انہدام اور اسلامی نظامِ زندگی کے غلبہ اور تحفظ کے لیے جس نوعیت کی جدوجہد کی ضرورت ہے اس کی بھی تین جہتیں ہیں:

اولاً: فریضۂ اسلامی انفرادیت کا فروغ اور سرمایہ دارانہ انفرادیت کا انتشار ہے۔

اسلامی انفرادیت کے فروغ سے مراد یہ ہے کہ فرد معاش کو محض معاد کمانے کا ذریعہ سمجھے۔

☆ آزادی کو بحیثیت قدر کے رد کر کے عبدیت کو اختیار کرے۔

☆ مساوات کو بحیثیت قدر کے رد کرے اور نظامِ ارشاد میں کسی پاک نفس مرشد کا مطیع بن جائے۔

☆ ترقی کو بحیثیت قدر کے رد کر کے معرفت کے حصول کی جستجو کرے۔

ظاہر ہے کہ عوامی سطح پر اسلامی شخصیت اور تعمیر کا کام صوفیاء کرام اور اولیاء اللہ کا دائرہ کار رہا ہے اور برِصغیر کی پوری تاریخ عوامی تطہیرِ نفس کی تحریکات سے بھری پڑی ہے جن کی قیادت حضرت معین الدین چشتیؒ، حضرت علی ہجویریؒ، حضرت نظام الدین اولیاءؒ، حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ رحمہم اللہ اجمعین جیسے اکابر صوفیا نے فرمائی۔ عوامی سطح پر اسلامی شخصیت سازی کی ذمہ داری صوفیائے کرام کی ہے اور یہ فریضہ کوئی دوسرا گروہ سرانجام نہیں دے سکتا۔

ثانیاً: اسلامی معاشرت کے غلبہ کی ذمہ داری ہے۔

اسلامی معاشرت میں:

☆ علومِ اسلامی اور اسلامی عقلیت کا غلبہ ہوتا ہے اور غیر اسلامی علمیاتی منہج (بالخصوص سائنس اور سوشل سائنس) غیر معقول اور غیر معتبر گردانی جاتی ہیں۔

☆ روابط اور تعلقات کی بنیاد صلۂ رحمی اور خونی رشتے ہوتے ہیں۔ خاندان، قبائل اور شعوب، اسلامی معاشرت کی بنیادی اکائیاں ہوتی ہیں۔ غرض (Interest) کی بنیاد پر تعلقات استوار نہیں کیے جاتے۔

☆ روحانی ثقافت شہوانی ثقافت کو کچل دیتی ہے۔ علاقائی اور نسلی رسوم و رواج اسلامی عصبیت کے اظہار اور مقاصدِ شریعت کے حصول کا ذریعہ بن جاتے ہیں، مسجد، مدرسہ اور خانقاہ اسلامی ثقافت کے محور اور مرکز بن جاتے ہیں۔ تمام ثقافتی مظاہر مذہبیت کے رنگ میں ڈوب جاتے ہیں۔

☆ سرمایہ دارانہ ملکیت (Corporate Property) تحلیل ہو جاتی ہے۔ سود کا بازار اور سٹہ کا بازار (Money and Capital Markets) مفقود ہو جاتے ہیں۔ حلال رزق کمانے کے ذرائع عام ہو جاتے ہیں۔ کاروبار حصولِ معاد کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ مارکیٹ کی جگہ بازار لے لیتے ہیں انفاق اسراف کو مسخر کر لیتا ہے۔ معیارِ زندگی میں بڑھوتری کی جستجو غیر معقول ہو جاتی ہے۔ دولت سرمایہ کی غلاظت سے پاک ہو جاتی ہے۔

اسلامی معاشرت کے قیام اور غلبہ کی بنیادی ذمہ داری علمائے کرام، مصلحین کی جماعتوں، ائمہ مساجد، قبیلوں، برادریوں اور خاندانوں کے سربراہوں اور اسلامی کاروبار منظم کرنے والے حضرات کی ذمہ داری ہے۔ ہماری تاریخ میں انہیں طبقوں نے اسلامی معاشرت کو زندہ رکھا ہے اور یہی حضرات اسلامی ثقافت کا احیا بروئے کار لا سکتے ہیں۔

ثالثاً: اسلامی ریاست کے قیام کی ذمہ داری ہے۔

ریاست سے مراد نظامِ اقتدار ہے۔ اسلامی ریاست اس وقت وجود میں آتی ہے جب کسی علاقہ کے باشندے احکامِ شریعت کے مطیع ہو جائیں اور اس علاقہ میں حاکمیت کا جواز (Legitimacy) شرعِ مطہرہ اور صاحبِ شریعت کی اطاعت ہو۔ یہ علاقہ ایک محلّہ جتنا محدود اور تمام دنیا جتنا وسیع بھی ہو سکتا ہے۔ شرعاً صرف یہ ضروری ہے کہ علاقہ کا حاکم نہ کسی کا نمائندہ ہو نہ مطلق العنان ہو بلکہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ (یعنی سلطان ظل اللہ ہو) سقوطِ سلطنتِ عثمانیہ تک کرۂ ارض کے ایک وسیع علاقہ میں اسلامی ریاست قائم تھی اور آج بھی مجاہدین جا بجا اسلامی سلطنتیں قائم کرنے میں کامیاب ہو رہے ہیں۔ مثلاً ایران، سوڈان، یمن، فلسطین، چیچنیا، افغانستان، صومالیہ، مالی اور سینٹرل افریقن ریپبلک کے مفتوحہ علاقوں میں۔

سرمایہ دارانہ ریاست کے انہدام کے دو ذریعے یہ ہیں:

(الف) سرمایہ دارانہ ریاستی ادارتی صف بندی کو کمزور کرنا اور ان کی قوتِ نافذہ کی تحدید...... اس ہدف کو حاصل کرنے کے لیے جمہوری عمل اور ریاستی انتظامیہ کے تضادات کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظامِ اقتدار غرض، حرص اور ہوس کی حاکمیت کا دوسرا نام ہے۔ اس نظامِ اقتدار کو بتدریج معطل کیے بغیر مقاصدِ شریعہ حاصل نہیں کیے جا سکتے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ بہت سی اسلامی سیاسی جماعتیں سرمایہ دارانہ نظامِ اقتدار کو مقاصدِ شریعت کے حصول کا ممکنہ ذریعہ سمجھنے لگی ہیں اور بیشتر غیر سیاسی اسلامی جماعتیں سرمایہ دارانہ نظامِ اقتدار کو تحلیل کرنے کی ضرورت کی قائل نہیں۔ وہ اس کے وجود سے صرفِ نظر کرتی ہیں، ان کے خیال میں یہ نظامِ اقتدار دعوتِ دین کے فروغ اور اسلامی معاشرت کے قیام میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالتا۔ اس رویہ کے نتیجہ میں سیاسی اور غیر سیاسی جماعتیں عملاً سرمایہ دارانہ نظامِ اقتدار میں بتدریج سمودی جاتی ہیں۔

(ب) دوسرا ذریعہ اسلامی ریاستی صف بندی ہے۔ آج ہم نے اس ضمن میں خاصا تجربہ حاصل کر لیا ہے۔ اس حکمتِ عملی کی تنفیذ کا بنیادی ذریعہ مساجد کے علاقائی اقتدار کا فروغ ہے۔ محلّہ اور بازار کی سطح پر کئی ممالک میں مساجد ان معنوں میں بااقتدار بنا دی گئی ہیں کہ وہ علاقے میں امن قائم رکھنے اور عادلانہ فیصلوں کی تنفیذ کی اہلیت حاصل کر گئی ہیں۔ وہ نہ صرف دارالافتاء اور دارالقضاء بن گئی ہیں بلکہ ان میں اتنی قوت اور اقتدار مجتمع ہو گیا ہے کہ وہ اپنے فیصلے محلّہ اور بازار کی سطح پر نافذ کر سکیں، مسلمانوں کے کئی شہروں میں ایسے بین المسلکی وفاق المساجد قائم ہو گئے ہیں جنہوں نے سرمایہ دارانہ انتظامیہ اور عدلیہ کو عملاً محلّہ اور بازار کی سطح پر بے دخل اور اپنے فیصلوں کا پابند کر دیا ہے اور ان علاقوں سے غیر شرعی کاروبار (مثلاً بینک، سینما، وڈیو شاپ، مخلوط تعلیمی ادارے) بے دخل اور معطل کر دیئے ہیں۔ آج کئی ایسے مسلمانوں کے ممالک موجود ہیں جہاں حکومت تو غیر اسلامی ہے لیکن اسلامی ریاستی نظام ان کی حدود میں بتدریج طاقت ور ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس نوعیت کے سب سے کامیاب تجربات جنوبی لبنان، افغانستان اور مشرقی صومالیہ میں کیے گئے ہیں، اور اس کام کی تنظیم اور تحکیم میں مجاہدینِ اسلام کی جماعتوں کا بنیادی کردار رہتا ہے۔ ریاستی تعمیر کی اس نوعیت کی جدوجہد عموماً دشوار گزار علاقوں تک محدود رہی ہے اور گنجان آبادی کے علاقوں میں (بالخصوص دارالحکومت کے اردگرد) اسلامی انقلابی ادارتی صف بندی کمزور، نسبتاً بے اثر ہے، اور ان علاقوں میں اپنا وجود برقرار رکھنے کے لیے اسلامی انقلابی قوتیں بالادست سیکولر مقتدرین سے سمجھوتے کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ بات بیروت، موغادیشو، اور قندھار تک کے لیے کہی جا سکتی ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کے انہدام کی تحریک کو جس بنیادی چیلنج کا سامنا ہے وہ غیر سرمایہ دارانہ اسلامی شخصیت، غیر سرمایہ دارانہ اسلامی معاشرت اور غیر سرمایہ دارانہ اسلامی نظامِ اقتدار کے کام کو مربوط کرنا ہے تاکہ سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کے متبادل اسلامی نظامِ زندگی عملاً متحرک اور زور پکڑتا ہوا نظر آئے۔ انفرادی، معاشرتی اور ریاستی تعمیر کی جدوجہد کو مربوط اور مستحکم کرنا جماعت اسلامی کی ذمہ داری ہے۔ جماعتِ اسلامی تمام راسخ العقیدہ اسلامی تحریکات کی رابطہ کی جماعت ہے۔ اس کی کوشش ہونی چاہیے کہ جو کام مزکی اور صوفیاء اسلامی شخصیت سازی کے لیے کر رہے ہیں، جو کام علما اور مصلحین کی جماعتیں اسلامی معاشرت کی تعمیر کے لیے کر رہی ہیں اور جو کام اسلامی سیاسی

جماعتیں اور مجاہدینِ اسلامی نظامِ اقتدار کے قیام اور استحکام کے لیے کررہے ہیں اس کو اس طرح مربوط کیا جائے کہ سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی بتدریج منتشر ہوتا چلا جائے۔ سرمایہ دارانہ علمیت غیر معقول نظر آنے لگے۔ سرمایہ دارانہ اخلاقیات غیر معتبر ہوتی چلی جائیں، سرمایہ دارانہ معاشرتی صف بندی بکھر جائے، سرمایہ دارانہ نظامِ اقتدار کی قوتِ نافذہ بتدریج تحلیل ہوتی چلی جائے۔ اسلامی شخصیت سازی، تعمیرِ معاشرت اور ترتیبِ اقتدار کی جدوجہد کے کام میں ارتباط پیدا کیے بغیر غلبۂ دین ناممکن ہے۔

برصغیر میں جماعتِ اسلامی مختلف النوع اسلامی جدوجہدوں میں ارتباط پیدا کرنے کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ جماعتِ اسلامی کو کسی دوسری اسلامی جماعت پر کوئی فوقیت حاصل نہیں لیکن جماعتِ اسلامی کی چند ایسی خصوصیات ہیں جن کی بنا پر وہ تمام راسخ العقیدہ جماعتوں میں ایک رابطہ کی جماعت کا رول ادا کر کے انہدامِ سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کی ہمہ جہت جدوجہد کو مربوط کرسکتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جماعت اسلامی کی اپنی کوئی منفرد فقہ نہیں۔ مولانا مودودی فقیہہ نہیں ایک متکلم اسلام تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جماعت اسلامی میں تمام اسلامی مذاہب اور مکتبہ ہائے فکر کے لیے یکساں گنجائش موجود ہے اور اس کے کارکن بریلوی، دیوبندی، اہلِ حدیث، اہلِ تشیع سب ہی ہیں۔ ان خصوصیات کی بنیاد پر یہ تمام دیگر راسخ العقیدہ جماعتوں سے منفرد ہے۔ اس کا ہر کارکن دین سے وابستگی کو مسلکی وابستگی پر فوقیت دیتا ہے اور اس کا بنیادی پیغام ہے۔

کہو ہر کارکن سے ہر جتھا ہے اپنا گھر یاور

ہر اک بھائی بنا اپنا حلیف وہمسفر یارو

جماعت اسلامی تمام اسلامی جماعتوں کو عزت اور احترام کی نظر سے دیکھتی اور مولانا مودودی اور دیگر تمام امراءِ جماعت نے کبھی بھی جماعت کی فوقیت کا کوئی دعویٰ نہیں کیا۔ اتحاد اسلامی کو فروغ دینا جماعت کی ہمیشہ اولین ترجیحات میں شامل رہا ہے اور سرمایہ دارانہ نظام زندگی کے انہدام کی کثیر الجہت اسلامی جدوجہد کو مربوط کرنا جماعت اسلامی کے لیے ایک فطری تقاضہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ مولانا مودودی بیسویں صدی کے وہ پہلے متکلم اسلام ہیں جنہوں نے شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے تصور نظام کے احیاء کی جستجو کی اور اس کو تصور اسلامی انقلاب سے مربوط کیا۔ آج اللہ کے فضل سے ان دونوں نظریات کو اسلامی حلقوں میں مقبولیت عام حاصل ہے اور کوئی اسلامی مکتب فکر اسلام کی نظاماتی حیثیت اور اسلامی انقلاب کی ضرورت کا منکر نہیں۔ ان نظریات کی بنیاد پر عملی جدوجہد کو مرتب کرنا جماعت اسلامی ہی کی ذمہ داری ہے، اور اس ہی جماعت کا یہ فرض ہے کہ ہر وہ اسلامی جماعت جو اسلامی نظام اور اسلامی انقلاب کے تصور کو اصولاً قبول کرتی ہے اس کے لیے انہدام سرمایہ داری کو اپنی عملی جدوجہد میں شامل کرنے کے لیے گنجائش پیدا کرے۔

☆......آخری بات یہ ہے کہ مولانا مودودی ہی نے مغرب کو جاہلیت خالصہ گردانا اور اس بات کا اعادہ کیا مغربی نظام زندگی کی جزوی اصلاح اور اسلامی ترتیب تو ناممکن ہے (یہی خصوصیت آپ کو علامہ اقبال اور مولانا محمد علی جوہر جیسے مفکرین سے جدا کرتی ہے اور اس ہی وجہ سے آپ نے Reconstruction of Religious thought in Islam کی رد کے طور پر اپنی کتاب، اسلامی تہذیب اور اس کے اصول ومبادی تحریر فرمائی) مولانا مودودی کے علم کلام کی توسیعی اور ارتقاء کا بنیادی تقاضہ ہے کہ اس علم کلام کی بنیاد پر سرمایہ دارانہ نظام زندگی کی ہمہ جہت اور بھرپور تنقید مرتب کی جائے اور اس نقد کی بنیاد پر سرمایہ دارانہ نظام کے انہدام کی ہمہ پہلو جدوجہد برپا کی جائے۔ مولانا مودودی کی نیم مستشرقانہ (Post Oreintalist) لبرل تشریحات جن کو آج مغرب زدہ جامعات فروغ دے رہی ہیں، مولانا مودودی کے انقلابی منہج سے انحراف کے علاوہ کچھ نہیں۔